

سید خورشید احمد گیلانی

روحِ تصوف

اسلام کے مثالی نظام حیات کی ایک جھلک

فرید نکشال اردو بازار لاہور

منشورات علمیہ

تصانیف مولانا ابوالخیر محمد بشیر کوٹلوی

فرید بک سٹال لاہور کی ایک سالہ اشاعتی خدمات ایک نظر میں

طب روحانی ۶/۹۰ ، ترمذی شریف مترجم گل دجلہ ۵۰/-	۲۳/-	بیات اول	جلد دوم پاسنگ
فتاویٰ عالمگیری ۶۵۰/- ، منتخب شیش جلد دوم پاسنگ ۱۸/-	۲۴/-	دوئم	
جوانہ ابلاغہ ۶۰/-	۲۴/-	سب	
زینت و زنجیر اول ۲۳/-	۲۴/-	نکاح اول	
ذکر بابہر ۱۳/۵۰	۲۴/-	دوئم	
کوشا تجربات شیخ محمد بن قاسم شریف سیاری ۳۰/-	۲۴/-	سوم	
نسیم رحمت ۵۰/-	۲۴/-	چہارم	
اشعۃ القمات اول (ترجمہ مولانا محمد سعید نقشبندی) ۶۵/-	۲۴/-	ید اللہ خلیفین	
مسند امام اعظم ۲۲/-	۲۲/۵۰	بانہ نور کا	
تذکرۃ الاولیاء ۱۸/-	۲۶/-	توں کی حکایات	
دلائل المسائل (فقہ اعظم کوٹلوی) ۲۶/-	۱۶/۵۰	حکایات اول	جلد ڈسٹ کور
فتۃ الغیبہ ۲۶/-	۱۸/-	دوئم	
شمع شبستان رضا جلد دوم پاسنگ مکمل چار حصے ۳۶/-	۱۸/-	سوم	
جلد ڈسٹ کور ۳۶/۵۰	۱۵/-	چہارم	
روح تصوف (از مستنیر خورشید احمد گیلانی) ۱۸/-	۱۵/-	پنجم	
سال ہذاں کے اشاعتی منصوبے اپنے پتے تکمیل مرآل میں	۱۶/۵۰	۱۱ کی حکایات	
اشعۃ القمات جلد دوم ۱۶/۵۰	۱۲/-	۱۱ کی حکایات	
بخاری شریف مکمل مترجم تین جلدوں میں ۱۲/-	۱۵/-	سب کیخبر آٹک جازوں کی دنیا	
ریاض الصالحین مترجم مکمل دو جلدوں میں ۱۵/-	۱۶/۵۰	نئی مدخل (فقہ اعظم کوٹلوی)	جلد پارچہ
معالمت سعیدی (مولانا غلام رسول سعیدی) فیوض یزدانی ۱۶/۵۰	۲۱/-	دوق	جلد ڈسٹ کور
ابوداؤد شریف تین جلدوں میں ۲۱/-	۲۶/-	بشتی زبور (نئی مدخل غلام کوٹلوی)	جلد دوم پاسنگ
علمائے اہل سنت کی حکایات (ابوالمنہ کوٹلوی) ۲۶/-	۱۵/-	اسلام	جلد پارچہ
جامع المعجزات (صاحبزادہ مولانا محمد سعید کوٹلوی) ۱۵/-		ملاوہ از میں پیکاراہوں کی کسلائی مہرمات بھی متوک پرچون نغوں پر پاس سے ہاں دستیاب ہیں ، رابطہ کے لئے تحریر کیجئے	

فرید بک سٹال ۴۰- اردو بازار، لاہور

سید خورشید احمد گیلانی

رُحِ تصَوُّف

اسلام کے مثالی نظامِ حیات کی ایک جھلک

ریڈیکل سٹال • اردو بازار • لاہور

marfat.com

Marfat.com

نام کتاب	روح تصوف
مصنف	سید خورشید احمد گیلانی
مطبع	عالیین پبلیکیشنز پریس ۲۲/۱۰ ریگین روڈ لاہور
کتابت	فضل الہی کیلیا نوالہ
تعداد	ایک ہزار
بار اول	۱۹۸۱ء
قیمت	—

تقریب

۴	پیش لفظ : سید محمد فاروق قادری	۱
۲۴	پیش گفتار : سید ارشاد احمد عارف	۲
۳۴	روح تصوف	۳
۵۵	شرعیات و طریقت	۴
۶۴	کشف و کرامات	۵
۷۱	اہیات کتب	۶
۹۵	اشاعت اسلام اور صوفیا کرام	۷
۱۰۸	آئین جوان مری حق گوئی و بلے باکی	۸
۱۲۶	فقر غنیور	۹
۱۴۲	تاج شہی فقر کے قدموں پر	۱۰
۱۵۲	تعلیمات تصوف	۱۱
۱۵۶	توکل	۱۲
۱۶۴	فتر	۱۳
۱۶۱	توبہ	۱۴
۱۶۹	تقوایے	۱۵
۱۸۵	اخلاص	۱۶
۱۹۰	صبر	۱۷
۱۹۴	فتوت	۱۸
۱۹۹	ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	۱۹
۲۰۶	اشارہ	۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا میں ہر تحریک بہ تمام و کمال وقت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ کچھ تحریکوں اور افکار کو تو زمانے کی تیز رفتاری پوری قوت سے روند کر اس طرح ملیا میٹ کر دیتی ہے کہ اس کے آثار بھی نہیں ملتے، البتہ جو تحریکیں زیادہ سخت جان ہوتی ہیں وہ دیر تک وقت کے گرداب کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں، دنیا میں کچھ تحریکیں ایسی بھی اُٹھی ہیں کہ زمانہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے باوجود انہیں کجلا تک نہیں سکا، اور وہ ہر دور میں ایک نئی تازگی اور زندگی کے ساتھ اُبھرتی رہی ہیں جو تحریکیں اس سے کم تر درجے کی ہوتی ہیں وہ تاریخ کے رُخ پر موجود تو رہتی ہیں مگر اپنی اصلی حالت پر نہیں بلکہ رد و بدل، حک و اضائف اور ترمیم و تغیر کے ساتھ۔

اسلامی تصوف ایک تحریک کے طور پر تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اپنا کام شروع کرتا ہے، اگرچہ اس کی بنیادیں ہمیں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آتی ہیں، حضرت سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد اور عمار رضی اللہ عنہم دور اول کے وہ نمایاں افراد ہیں جن کی پوری زندگی زہد و عبادت اور تزکیہ نفس کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اہل بصیرت نے محسوس کیا کہ تمام ذرائع دولت اور وسائل عزت پر اہل حرص و جوائے پوری طرح قبضہ کر لیا ہے۔ مناصب حکومت کی لالچ اور دوپے پیسے کی ہوس نے لوگوں کو اس قدر پست ہمت کر دیا ہے کہ وہ اس کے علاوہ

کچھ سوچ بھی نہیں سکتے اور نہ ہی ان میں اتنا جذبہ باقی رہا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ نصب العین کی خاطر جان و مال کی قربانی دے سکیں یا اپنے عیش و آرام کو چھوڑ سکیں، ان ارباب عزیمت نے محسوس کیا کہ اگر بروقت اس خطرے کا نوٹس نہ لیا گیا تو یہ سیلاب اپنی روانی میں سب کچھ بہا لے جائے گا۔ چنانچہ حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ان میں سے ایک گروہ کسی کا حلیف عرفین بنے بغیر ملک ہو گیا اور اس نے اسلام کی انقلابی تعلیمات کی حفاظت کے لیے مختلف انداز میں کمر باندھ لی۔ ملوکیت کے دور نامہ تجارت میں اس طرز عمل کی افادیت کھل کر سامنے آنے لگی تو یہ فکر ایک تحریک کی حیثیت اختیار کرنا چلا گیا۔ نتیجہ نکلا کہ تیسری صدی کے اوائل سے ساتویں صدی ہجری تک اسلامی تصوف ایک نیمہ گیر تحریک کی حیثیت سے آگے بڑھتا رہا اور اس نے زندگی کے ہر شعبہ حیات کو متاثر کیا۔ ساتویں صدی ہجری کے بعد اس تحریک میں وہ جان باقی نہ رہی جو ابتدائی قوت اور شدت کی طرح وقت کا مقابلہ کرتی رہتی، دوسری طرف یہ تحریک اتنی پھیل چکی تھی کہ اب یہ ممکن ہی نہ رہا تھا کہ دور دراز کے ممالک میں بسنے والی اقوام کے افکار اور ان کے مخصوص سماجی اثرات سے یہ پوری طرح اپنا دامن بچا سکے۔

تصوف ایک علیحدہ تحریک کے طور پر کبھی وجود میں نہ آتا اگر مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بعد دین و دنیا کی تفریق کا سانحہ پیش نہ آتا۔ اس نازک موڑ پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی، خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی، خلافت میں نیابتِ سالت کا تصور ختم ہو گیا، بیت المال ذاتی ملکیت سمجھے جانے لگے۔ دروازوں پر دربان مقرر ہو گئے اور خلافت دین و دنیا کی اصلاح کا ادارہ نہیں بلکہ صرف دنیا داری کی ایک بگڑی ہوئی شکل اختیار کر گیا، مسلمانوں کا دین دار طبقہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اب حکومت کی ملازمت یا اس کے ساتھ تعاون دین کی خدمت نہیں رہی۔ ایسے لوگوں کے لیے حکومت سے سوائے قطع تعلق کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا

نظام حکومت بہترین قسم کے متقی اور جامع صفات شخصیتوں سے محروم ہو گیا۔
 ان مایوس کن حالات میں ردِ عمل کے طور پر یہ تحریک شروع ہوئی مگر خیال یہ ہے
 کہ یہ تحریک صرف اور صرف اسلامی نظامِ اخلاق و عبادات کے تحفظ کے لیے اٹھی۔ یہ نہ تو
 کسی عجمی سازش کا نتیجہ تھی اور نہ ہی دوسری اقوام کے افکار سے تاثر کا حاصل، اسلامی تصوف
 کی ساری اصطلاحات قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں، مثلاً توبہ، صبر، توکل، رجا، خوف،
 تقویٰ، فقر، محاسبہ، تزکیہ، اخلاص، امانت، خشیت۔ ہمیں دلراشکوہ کی اس بات
 سے اتفاق ہے کہ تصوف اسلام سے بہت پہلے انسانی فکر میں آچکا تھا اور انیشنڈل
 میں اس کی مستند تصدیقات ملتی ہیں، لیکن اسے اُس تصوف سے کیا واسطہ ہے جس
 کے داعی اپنے تمام معتقدات و معمولات کی بنیاد صرف قرآن کو ٹھہراتے ہیں۔
 گروہِ صوفیاء کے سید الطائفہ جنید بغدادی فرماتے ہیں:
 ”اِس راہ کسے یاد کہ کتاب بردست راست گرفتہ باشد و سنت مصطفیٰ
 صلی اللہ علیہ وسلم بردست چپ و در روشنائی اِس روشمے رود،
 تانہ در مفاک شبہت افتد نہ در ظلمت بدعت۔“
 یہ راہ تو صرف وہی پاسکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں
 سنت رسول ہو اور وہ ان دو چراغوں کی روشنی میں راستہ طے کرے تاکہ نہ شبہ کے
 گر پھوں میں گرے نہ بدعت کی تاریکی میں پھنسے۔
 شیخ ابوبکر طمسانی فرماتے ہیں،
 الطريق واضح والکتاب والسنت قاضی بین اظہرنا

۱۔ تذکرۃ الاولیاء : ۸

۲۔ سالہ تشیرہ : ۲۲

marfat.com

Marfat.com

راستہ واضح ہے اور کتاب و سنت ہمارے سامنے ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں :

(مشرپ پیر) ... حجت فی شہود دلیل از کتاب و حدیث سے باید

رہبر کا مسلک، حجت نہیں ہے دلیل کتاب و سنت سے ہونی چاہیے،

حضرت سید علی عجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

رکن اول از شریعت کتاب است چنانکہ گفت عرمن قال فیہ

آیات محکمات من ام الکتاب، و دیگر سنت است چنانچہ گفت

وما اتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فاتہوا

و سیوم اجماع امت چنانکہ رسول علیہ السلام گفت لا تجتمع امتی

علی الضلالة علیکم بالسواد الاعظم،

شریعت کا پہلا رکن کتاب اللہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، قرآنی میں آیات

محکمات ہیں، جو اصل کتاب ہیں۔ دوسرا رکن سنت ہے جیسا کہ فرمایا، جو کچھ تمہیں رسول

عطا فرمائیں اس پر عمل کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ، اور تیسرا رکن اجماع

امت ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری امت گمراہی پر جمع نہیں

ہوتی، بڑے گروہ کا ساتھ پکڑو۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی فرماتے ہیں :

سے برادر تفاوت مراتب فقر اگر امروز خواہی کہ دریائی بجانب شریعت او

نگاہ کن کہ شریعت معیار است

اے بھائی اگر تم فقر کے مدارج دیکھنا چاہتے ہو تو شریعت پر ان کے عمل سے ان کا اندازہ لگاؤ، کیونکہ اس بارے میں معیار شریعت ہی ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

پیر چنان باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد و چوں
ایں چنین باشد او خود هیچ نام شروع نہ فرماید؛

پیر ایسا ہونا چاہیے جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کا عالم ہو اگر وہ
ایسا ہوگا تو خود کسی نام نہ نہا کر کے بارے میں نہیں کہے گا۔

ابو الحسن نور علی تصوف کی تعریف میں فرماتے ہیں:

التصوف ترك كل حظ
لنفسه
تصوف حظ نفس چھوڑنے کا نام
ہے۔

ابو علی قزوینی فرماتے ہیں:

التصوف هو الاخلاق المرضية
لنفسه
تصوف پسندیدہ اخلاق کا نام ہے۔

ابو سہل الصعلوی فرماتے ہیں:

الاعراض عن الاعتراض
لنفسه
تصوف اعتراض سے بچنے کا نام ہے۔

ابو محمد الجربری فرماتے ہیں:

التصوف الدخول في كل
مخلوق سني و الخروج من
كل خلق دني
تصوف ہر نیک خصلت سے مزین
ہونا اور تمام بُری عادتوں سے چھٹکارا
حاصل کرنے کا نام ہے۔

مخلوق سنی و الخروج من

كل خلق دني

۱۔ رسالہ قشیریہ : ۱۳۸

۲۔ ذرائع النواذ : ۱۲۷

۳۔ رسالہ قشیریہ : ۱۲۷

۴۔ کشف المحجوب باب سوم فی تصوف

۵۔

marfat.com

Marfat.com

عمر بن عثمان المکی سے تصوف کے متعلق پوچھا گیا آپ نے فرمایا :
 ان یكون العبد فی كل صوفی ہر وقت جس کا ہوتا ہے اس
 وقت بما هو اذ فی بہ فی کا ہو کر رہتا ہے۔
 الوقت ۛ

ان اکابرین صوفیا کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف تزکیہ نفس اور تصفیہ
 اخلاق ہی کا نام ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بعثت کا مقصد یہی بیان
 فرمایا ہے :

بعثت لا تمم مکارم الاخلاق
 قرآن مجید میں منصب رسالت کے فرائض کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ :
 ویزکیہم ویعلم الکتاب والحکمۃ

جس طرح ہم نے شروع میں عرض کیا ہے کوئی تحریک کتنی اچھی کیوں نہ ہو بہ تمام و کمال وقت
 کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ بلاشبہ یہی حال تصوف کا بھی ہوا۔ شریعت و طریقت کی تفریق
 دنیا سے فرار اور گریز اور مجاہد پرستی کے ذریعے کئی خرافات اس میں گھس آئیں، اس کا
 نتیجہ یہ نکلا کہ خود مسلمانوں میں سے بعض حضرات نے انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ تصوف
 کو اسلام کے خلاف ایک سازش کا عنوان دے دیا۔ بعض دوسروں نے تقسیم شروع کر دی
 کہ تصوف کی اتنی قسمیں ہیں : ایک یہ ہے، ایک یہ ہے اور ایک یہ، یہ اس طرح ہے
 جیسے کوئی شخص بد عمل مسلمانوں کو دیکھ کر یا مسلمانوں کی تیسرے درجے کی غیر ثقہ کتابیں پڑھ
 کر اسلام کی تقسیم شروع کر دے۔ اگر یہ تقسیم درست مان لی جائے تو پھر یہ صرف تقون ہی
 تک کیوں محدود ہے۔ دور ملکیت میں مدون ہونے والے بعض فقہی فتاویٰ اور یونانی

علوم کی مدافعت میں مرتب شدہ علم کلام کیوں اس کی ذیل میں نہیں آتے، سیدھی بات ہے کہ تصوف اسلامی میں جہاں جہاں خرافات گھس آئی ہیں انہیں کسی بھی صورت میں تصوف کا نام نہیں دیا جاسکتا، ایسی باتوں کا تصوف سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ خود اکابر صوفیائے اپنے اپنے دور میں ان برائیوں کے خلاف ہمیشہ ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔ آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ کی مساعی اسی نوعیت کی ہیں۔

اسی وقت یہ نظریہ اتنی عمومیت اختیار کر گیا ہے کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسلامی تصوف ایرانیوں سے ماخوذ ہے یا پھر یونانیوں سے۔ دسمل یہ براؤن اور نکلسن کا نظریہ ہے، جو انہوں نے اسلامی تصوف کے اصل ماخذ سے لاعلمی کی بنیاد قائم کیا اور آگے فیشن کے طور پر چل نکلا، حالانکہ مستشرقین میں سے بعض حضرات کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ تصوف نے ہر آڑے وقت میں اسلام کی سپر کا کام دیا ہے۔ مشہور ہے مستشرق پروفیسر ایچ اے آر گب (H.A.R. Gibb) نے ایک دفعہ اپنی تقریر میں کہا تھا:

تاریخ اسلام میں بار بار ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا ہے لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا، اور اس کو اتنی قوت و توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

عبادت الہی ایک فریضے کے طور پر ادا کرنا مستحق علیہ مسئلہ ہے لیکن اس میں دل کشی، جاذبیت، محبت اور ایک خاص کیفیت پیدا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک

بندے کو اپنے خالق کے ساتھ تعلق اور اس کی کیفیات سے پُردے طور پر آگاہی نہ ہو،
اسی کیفیت کو ہم محبت خداوندی یا قرب ذاتی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید کی ان آیات
پر غور کیجئے،

وہو معکم ما ینماکنتمؕ اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں
تم ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،

ولا تستخفون من اللہ وہو
معہ ؕ اور تمہیں شرماتے اللہ سے اور وہ اُن
کے ساتھ ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا،

واذا سالک عبادی عنی فانی
قرب ؕ اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے
مجھ کو سو میں تو قریب ہوں۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہے،

نحن اقرب الیہ من جبل الودیدؕ ہم انسان سے اس کی شدہ رگ سے
بھی زیادہ قریب ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے،

فاینما تولوا فثم وجہ
اللہ ؕ سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی
موجود ہے اللہ۔

آلہ الحید : ۴

آلہ النساء : ۱۰۸

آلہ البقرہ : ۱۸۶

marfat.com

Marfat.com

یہ چند آیات ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہیں۔ حد نہ قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر خدا اور بندے کے تعلق، اس کی لطیف کیفیات، اس کے آداب اور تقاضوں کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف کا اصل موضوع ہی خدا اور بندے کا تعلق ہے۔ اگر بندہ اپنے مالک حقیقی کے ساتھ اپنے تعلق کی کیفیات کا صحیح ادراک حاصل کر لیتا ہے تو زندگی کے باقی سارے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اس تعلق کے ادراک کے نتیجے میں بندے کو ہر وقت مالک کی خوشنودی اور رضا مندی کا سودا سر میں سمایا رہتا ہے اسے قدم قدم پر اس نازک تعلق کی باریکی کا احساس دامن گیر رہتا ہے۔ اس کا چینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، بولنا، خاموش رہنا، سب کچھ اسی ایک ذات کے لیے ہو جاتا ہے۔ غور فرمائیے کہ کس قدر آفاقی اور عظیم نظریہ ہے اور اس کے دامن میں کائنات اپنی وسعتوں کے باوجود کتنی حقیر نظر آتی ہے۔ اسی مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

قل ان صلاتی ونسکی
ومحیای ومماتی لله
دب العلمین ۛ

کہہ دو میری نماز، میری قربانی، میری
زندگی اور میری موت سب اسی
پروردگار عالم کے لیے ہے۔

اور اسی نظریے کو شیخ فرید الدین عطار نے اس طرح ادا فرمایا ہے:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی
خاکے شوم و بے زیر پائے تو زیم
از بہر تو میرم و برائے تو زیم

صوفیائے محبت الہی کو بنیاد اور قرب و محبت ذاتی کو منزل قرار دے کر فکر و عمل میں جو انقلاب پیدا کیا، تاریخ عالم میں پہلے ایسی کی نظیر نہیں ملتی۔ اس طرح وہ دکھ

کو عطیہ محبوب، ابتلا، و آزمائش کو امتحان، محبوں کو طعام دوست اور رنج و کلفت کو راہ عشق کے کائناتے سمجھ کر زندگی کی تلخیوں، ناکامیوں اور ناسمجھاریوں کو خوشگواہی، شہرت اور زیادہ بہتر اور قابل عمل طریقے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ تصوف فرار اور گریز ہے مگر غور جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ تصوف کا سارا رخ ہی انسان کی طرف ہے وہ مظلوم کی حمایت، ظالم کو ہدایت، سرکش اور مغرور لوگوں کو خادم انسانیت بنانے کی دعوت، خدا ترسی، ہمدردی، غم گساری اور رضا کارانہ خدمت کو عبادت کا درجہ دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تصوف نے عبادات میں جو لذت، حلاوت اور پچاشنی پیدا کی ہے اس نے خود زندگی میں مقصدیت اور حسن پیدا کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکومتوں کے عروج و زوال کی حیرت ناک داستانیں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں۔ ایک صوفی خدا سے لو لگا لے، من کی دنیا آباد کیے اپنے کام سے کام لےتا ہے۔ اگر صوفیاء کا حسن عمل اور اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی کا نصب العین مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ نہ ہوتا تو مسلمان برصغیر ایسے دور دلازمہ ملک میں سے اقتدار کے خاتمے کے بعد اسپیس کی طرح کب کا اپنا بستر بویا لپیٹ چکے ہوتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو ایک آفاقی پیغام کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس پیغام کا سارا پر و گرام عدل، انصاف، مساوات اور دنیا کے انسانیت کے لیے ایک فلاحی معاشرے کے قیام پر مبنی تھا، خلافت راشدہ کے بعد اس پر و گرام کی قیادت و سیادت ہمیں صوفیاء کے طرز عمل میں ملتی ہے۔ انہوں نے انسانیت کو الخلق عیال اللہ قرار دے کر بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و ملت، خدمت کو اپنا شعار قرار دیا، دور دراز ممالک میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں انہوں نے جس حکیمانہ شرف نگاہی اور فہم اندیشی سے کام لیا وہ انہی کا حصہ ہے انہوں نے ہر ملک و قوم کی مخصوص سماجی و ثقافتی روایات سے براہ راست تصادم اور ٹکرائی بجائے خود ان سے تبلیغ کا کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ

انہیں اس سلسلے میں بعض اوقات مجبوراً بعض نسبتاً غیر ادنیٰ طریقے بھی اختیار کرنا پڑے۔ چونکہ ان کی پشت پر کوئی سیاسی قوت موجود نہیں تھی۔ اس لیے وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ اسی طرح برصغیر ایسے ممالک میں ہم آج ایک زندہ سیاسی قوت کے طور پر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں موجود ہیں کہ ہمارا آئندہ لائحہ عمل اور سیاسی دلی پروگرام کس طرح تشکیل پائے۔ یہیں حیرت ہے کہ ہمارے وہ رہنما جو صوفیہ کے طرز تبلیغ پر سیدہ نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں، یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر بقول آپ کے صوفیہ کی یہ اپالاج تبلیغ بھی نہ ہوتی تو برصغیر میں آپ کی پوزیشن کیا ہوتی؟ اور کیا کسی فیصلہ کن گفتگو کے آپ اہل ہوتے؟ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ تصوف کے راستے سے کچھ خرابیاں و آئیں مگر یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اتنی پرانی اور عظیم تحریک کے لیے ایسی باتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں بالخصوص اس وقت جبکہ ہمارے پاس اس تحریک کے اصول و فروع پر مشتمل اساطین صوفیہ کی ملن کر وہ اہمات کتب موجود ہیں۔ میں کہتا ہوں اسلامی تصوف کے برس با برس بعد شیخ محمد بن الوہاب نجدی کی زیر قیادت بظاہر جو اصلاحی تحریک اُمّی چند ہی برسوں میں اس کا نتیجہ کیا نکلا، یہی ناکہ اس کے داعیوں نے اس مہذب و مدین دنیائے نقشے پر ایک جدید ملوکیت نما شہنشاہیت کی بنیاد رکھ دی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تصوف کے دستور العمل یا نصاب کے بارے میں مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔

تصوف میں بیعت کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے اور یہ کتاب و سنت سے

ثابت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

ان الذین بیایعونک
انما یبایعون اللہ
تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے
وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔

دوسری جگہ فرمایا :

لقد رضى الله عن تحقيق الله خوش ہوا ایمان والوں سے
المومنین اذ یبایعونک جب بیعت کرنے لگے آپ سے اس
تحت الشجرة ۱۔ درخت کے نیچے۔

تصوف میں دوسری اہم بات مرشد کی صحبت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تزکیہ نفس
نفوس کے لیے صرف کتابیں کافی ہوتیں تو انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری نہ کیا جاتا
جس طرح آج بعض علوم صرف پڑھنے سے نہیں آتے بلکہ لازماً ان کی پریکٹیکل کرنا پڑتی ہے
اسی طرح تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ایسا آسان کھیل نہیں کہ آپ حب اور جس وقت
چاہیں کسی کو محض کتابوں سے متقی، خدا ترس، دیانت دار اور خدمت گزار بنا دیں،
اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر دور میں ایسے خاصانِ خدا رہیں جو فکر و عمل کی پاکیزگی
سے لوگوں کی تقدیریں بدلتے رہیں۔

تصوف میں تیسری بات خلوت گزینی ہے اس کی بنیاد غار حرا میں آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلم کی وہ گوشہ گیری ہے جس میں آپ نے آثارِ قدرت پر غور و خوض اور عرفانِ ذات
کا مجاہدہ فرمایا، جس وقت طبیعت میں حقائق کا ادراک جاگزیں ہو جائے پھر لوگوں سے
اختلاط نقصان نہیں دیتا لیکن عرفان نفس اور دل کو مجتبیٰ و مصفا کیے بغیر لوگوں سے
میل جول کئی بیماریوں کو جنم دے سکتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تعلیم
کی خاطر ایسا عمل فرمایا۔

تصوف کی ایک بنیادی تعلیم محبت خداوندی ہے، یعنی اس کو چہ میں قدم رکھنے
والے ہر راہی کی منزل اور مقصد وصالِ خداوندی ہے، وہ اسی دھن اور تڑپ میں ہر

۱۔ الفتح ۲۔

marfat.com

Marfat.com

تکلیف کو راحت ہر خار کو پھول اور ہر مصیبت کو رحمت سمجھ کر آگے بڑھتا رہتا ہے،
اس کے تمام مجاہدات، ریاضتیں، عبادات راستے کی وہ ضروری منزلیں ہیں جنہیں
دیدارِ یار کی خاطر ہنس ہنس کر طے کرنا پڑتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ
حُبًّا لِلَّهِ ۖ
اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، وہ اللہ
کی محبت میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔

اس راہ میں مجاہدے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مجاہدہ کے معنی یہ ہیں کہ
اپنے محبوب حقیقی کی آرزو میں جہد مسلسل کی جائے اور اس باب میں کسی بات کی پرواہ
نہ کی جائے، ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا
فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ
اور جنہوں نے محنت (مجاہدہ) کی
ہمارے واسطے ہم سبھا دیں گے
سُبُلَنَا ۖ
ان کو اپنی راہیں۔

تصرف کا ایک مہتمم بالشان فریضہ عبادات اور ذکر و فکر میں مشغول و مصروف
رہنا ہے اس سے بے چین دلوں کو سکون اور غافل رنجوں کو آگہی نصیب ہوتی
ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا
لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۖ
اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم مراد
پا جاؤ۔

۱۶۵ البقرہ :

۴۹ العنکبوت :

۴۵ الانفال :

دوسری جگہ ارشاد ہے:

الذین یذکرون اللہ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے
قیماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم اور بیٹھے اور کھڑے پر لیٹے اور
ویتفکرون فی خلق فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی
السموات والارض نے پیدائش میں۔

آپ غور فرمائیے ان میں وہ کونسی ایسی بات ہے جو خود قرآن اور حاملِ شہرآن
صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت یا عمل نہیں ہے اس وقت ہمارے نامور صوفیاء کی
گراں قدر تصانیف موجود ہیں۔ دعوت سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نقیصہ کی
ان مایہ ناز بنیادی کتابوں میں کوئی ایک ایسی بات دکھائی جائے جو قرآن و سنت کے
خلاف یا اس سے متصادم ہو اسلامی تصوف کی بنیادی کتابیں یہ ہیں:

اللمع فی التصوف از ابو نصر سراج م ۳۸۶ھ، التعرف لمذہب اہل التصوف
از ابو بکر کلابازی م ۳۳۷ھ، قوت القلوب از ابو طالب المکی م ۳۳۷ھ، طبقات الصوفیہ
از ابو عبد الرحمن السلمی م ۳۴۲ھ، حلیۃ الاولیاء از ابو نعیم م ۳۴۲ھ، الرسالة القشیریہ از امام
قشیری م ۳۶۵ھ کشف المحجوب از علی بن عثمان چوہری م ۳۷۷ھ طبقات الصوفیہ از عبد
ہرودی م ۳۸۷ھ، فتوح الغیب از شیخ عبد القادر جیلانی م ۴۷۱ھ، تذکرۃ الاولیاء از
فرید الدین عطار م ۶۳۳ھ، عوارف المعارف از شیخ شہاب الدین سہروردی م ۶۳۳ھ،
الفتوحات المکیہ از شیخ محی الدین ابن عربی م ۶۳۸ھ، نفحات الانس از نور الدین جامی م ۸۹۰ھ
طبقات الکبریٰ از شیخ عبد الوہاب شعرانی م ۹۷۳ھ۔ اور اگر یہ کتابیں تول تا آخر
کتاب و سنت کی عمل کی دعوت دیتی ہیں، اپنی ہر بات کی سند قرآن اور سیرتِ محمدیہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے فراہم کرتی ہیں تو پھر تصوف کے بارے میں ہمیں در آمد شدہ نظریات تبدیل کرنا ہوں گے۔

اس وقت پوری دنیا شدید مسائل سے دوچار ہے ان میں سے دو مسئلے ایسے ہیں جن کا تعلق دنیا کی بقا سے ہے، یہ مسائل ہیں بھوک اور افلاس سے نجات اور خطرناک ایٹمی جنگ سے تحفظ، ہمارے نزدیک ان مسائل کے حل کی کوئی صورت سوائے اس کے نظر نہیں آتی کہ اقوام عالم صدق دل سے نظریہ الخلق عیال اللہ رساری دنیا اللہ کا کنبہ ہے، پر کار بند ہوں، یہی وہ آفاقی نظریہ ہے جس میں چھینا بچھٹی، ہوس ملک گیری کشت و خون اور کمزور کے حقوق غصب کرنے کا جذبہ، کسی قید میں مقید ہو سکتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں انسان ہر مخلوق کی تکلیف کو اپنے پہلو کا درد محسوس کرتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الہی سے کسی نے عرض کیا حضور! لوگ آپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ شیخ نظام الدین کو بڑا فروغ باطنی حاصل ہے انہیں اس جہان کا کوئی فکر ہی نہیں آپ نے فرمایا:

این قدر غم و اندوہ کہ مرا ہست پیچ کس را دریں جہاں نیست زیرا کہ چندیں خلق
مے آند و غم و اندوہ خویش مے گویند اک ہمہ بر دل و جان من نشیند عجیبے باشد
کہ غم برادر مسلمان بشنوند و در دے اثر نکند۔

جس قدر غم و اندوہ مجھے رہتا ہے اس جہاں میں کسی کو نہ ہو گا میرے پاس اتنی مخلوق
آتی ہے ہر شخص اپنا دکھ سنا رہا ہے اس کا بوجھ میری جان و دل پر پڑتا ہے وہ عجب دل ہے
کہ مسلمان مجاثی کا غم سنے اور اس پر اس کا اثر نہ ہو۔
غالباً اسی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ت قاریغ مشائخ چشت : ۴۸

خنجر کسی پر چلے ترپتے ہیں ہم اسی

سارے جہاں کا مرد ہمارے جگر میں ہے

شیخ سعدی نے زیادہ بہتر انداز میں اس کی توضیح کی ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضو ہمارا منسا ند قرار

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ آپ زر سے لکھنے کے قابل ہیں،

یہ خاں نہد و تو ہم خار نہی این خار خار باشد..... میان مرد ماں ہم چنین

است کہ با نغز اں نغز ای با کوزاں کوزی اما میان درویشاں ہم چنین نیست

کہ با نغز اں نغز ملی با کوزاں ہم نغز ملی۔

اگر کوئی خار رکھے اور تو بھی اس کے بدلے میں خار رکھے تو کانٹے ہی کانٹے

ہو جائیں گے۔ عام لوگوں کا دستور تو یہ ہے کہ اچھے کے ساتھ اچھے اور بُرے کے بدلے

بُورے ہوتے ہیں مگر درویشوں کا دستور یہ نہیں ہے، یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ

نیک ہونا چاہیے۔

آپ کی زبان پر اکثر یہ شعر جاری رہتا:

ہر کہ مارا رنجہ داد را عشق بسیار باد ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد

ہر کہ خارے افکند در راہ با اند دشمنی ہر گئے کز باغ عمرش بشکند بے خار باد

اسی طرح تمام اکابر صوفیا عملی طور پر بھی ملکیت کے مخالف رہے ہیں، ان کے ہاں

زہد اور توکل کا ثمرہ ہی یہی ہے کہ بچا کر کچھ نہ رکھا جائے، جمع نہ کیا جائے، اور لوگوں سے

کسی قسم کی امید نہ رکھی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طرز عمل بھی

تقریباً یہی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث میں کوئی درہم، دینار، بھیر بکری، نہیں چھوڑی جو معمولی چیزیں چھوڑیں ان کے بارے میں بھی فرمادیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ تمام اکابر صوفیا اسی اصول پر سختی سے کاربند رہے ہیں۔ انہوں نے اجتماعی معاشرے کی بنیاد رکھی۔ خانقاہوں میں اشتراکِ عمل کا نظام چلتا تھا جہاں شیخ بھی مریدین کے ساتھ روکھی سوکھی پر گزارا کرتا۔

صوفیاء کی تاریخ اس جلیبِ زر کے دور میں ہمارے پاس روشنی کا بلند میدان ہے جس نے ہمارے سرخسر سے بلند کر دیئے ہیں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ان بزرگوں نے جان کی بازی لگا کر اسلام کی روح کو زندہ رکھا، ٹھیک اسی طرح انہوں نے معاشی اور معاشرتی میدان میں بھی ہمارے لیے وہ ڈھانچے جوں کا توں محفوظ رکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا، لاکھوں کی یافت اور فتوحات ان کے معمولات پر اثر انداز نہ ہو سکے، سادگی، قناعت، دنیا سے نفرت اور خدمتِ خلق میں انہوں نے عمریں گزار دیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اکثر روزہ سے ہوتے۔ بعض اوقات سحری کے وقت خواجہ عبدالرحیم (خادم) کھانا لے جاتے اور عرض کرتے حضور! آپ نے افطار کے وقت بہت ہی کم کھانا تناول فرمایا تھا اگر سحری کے وقت تھوڑا تناول نہ فرمائیں گے تو ضعف بڑھ جائیگا اس پر آپ زار و قطار رونے لگتے اور فرماتے:

چندین مسکیناں و درویشاں در کنج ہائے مساجد و دواکانہا گرسند
فاقدہ افتادہ اند ایں طعام در حلق چگونہ فرورد۔

۱۔ تاریخ مشائخ چشت جناب خلیق احمد نظامی : ۵۴

کتنے مسکین اور درویش مساجد کے کونوں اور بازاروں میں بھوکے پڑے ہوئے ہیں۔ بھلا یہ کھانا میرے حلق سے کیونکر اتر سکتا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ملکیت کے دور میں ملکن ہونے والے ذخیرے بھی آزاد مسلم معاشرے کی بنیاد بننے کی اتنی صلاحیت نہیں رکھتے جتنی ہر دور میں ان سے نکلنے والے مردانِ خدا کی پاکیزہ اور بھرپور زندگیوں اس کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ہمارے لیے اس جدید دور میں یہی وہ سرمایہ ہے جسے ہم اقوامِ عالم کے سامنے بطور چیلنج کے پیش کر سکتے ہیں اگر صوفیا کی اس جدوجہد اور تحریک کو نہ مایلین تو پھر ہمارا تاریخی تسلسل باقی نہیں رہتا۔ کیا اسلام واقعی اس میں برسِ خلافتِ راشدہ کے بعد ختم ہو گیا، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تاریخ اسلام کی نمائندگی کا تاج بنو امیہ کی حکومتوں کے سر پر رکھے گی یا بنو عباس کی حکومتوں کے سر پر، تحریکیں خلا میں زندہ نہیں رہیں، ان کا واسطہ محسوسات اور حقائق سے ہوتا ہے۔ کیا ہوا اگر خلافتِ راشدہ کے خاتمے کی صورت میں سیاست اسلام کی ترجمان نہ رہی، یہ کوئی کم فضیلت کی بات ہے کہ اس کی معیشت و معاشرت اور اخلاق و تمدن پوری قوت اور آب و تاب سے بڑھتا رہا اور اس کے لیے گڈی پوش فقراء کی ایک بے سرو سامان جماعت بنے وہ کام کر دکھایا جو ایسی تحریکوں سے بھی نہ ہو سکا جن کی پشت پر مضبوط سیاسی اقتدار موجود تھا۔

صوفیاء کے کارناموں کو سمجھنے کے لیے پوری مسلم تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے تاہم مختصر الفاظ میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے انتہائی جامع انداز میں انہیں اس طرح بیان کیا ہے،

۱۔ اسلام کی جو پاکیزہ تعلیمات کتابوں میں درج ہیں اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں صوفیاء نے اپنی خالقوں میں ان پر عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا۔

۲۔ صوفیاء نے ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو زندہ رکھا۔

۳۔ صوفیاء سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا۔

۴ - صوفیائے بادشاہوں کے سامنے علی الاعلان کلمہ حق کہا۔

۵ - جب مسلمانوں میں عقلیت کا مذاق پیدا ہونے لگا اور انہوں نے قرآن کو اپنی عقل کے تابع بنانا شروع کیا تو صوفیائے محبت الہی کا درس دے کر عقلیت کے مضر نتائج کا انا لہ کیا۔

۶ - جب فقہائے دین کے ظواہر پر زور دیا تو صوفیائے باطنی اصلاح اور قلبی طہارت کا درس دے کر قوم کو اعتدال کی راہ دکھائی۔

۷ - صوفیائے ہر دور میں غیر اسلامی عقائد شرک اور بدعت کی تردید کی۔

۸ - سرمایہ داری کے مقابلے میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح کی۔

۹ - بادشاہوں کو دینداری کی تلقین کی۔

۱۰ - جب معتزلہ، فقہاء اور متکلمین منطقی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور امت کو فرقوں میں منقسم کر رہے تھے، اس وقت صوفیائے مسلمانوں کو توحید اور یک نگاہی کا درس دیا۔

۱۱ - جب فقہاء مسلمانوں کو آپس میں لڑا رہے تھے اس نازک دور میں صوفیائے ان کو محبت اور بہرہ رومی کا درس دیا۔

۱۲ - فقہاء اور متکلمین نے دفتوے دے کر مسلمانوں کو کافر بنا دیا مگر صوفیائے کرام نے اپنی زندگی کے ذریعے کافروں کو مسلمان بنایا۔

۱۳ - فقہاء، متکلمین اور معتزلہ نے مختلف مذہبی گروہ بنا کر مسلمانوں کے شیرازہ ملی کو منتشر کر دیا مگر صوفیائے سب مسلمانوں کو جام وحدت پلایا۔

۱۴ - علماء اور فقہاء بادشاہوں کا قرب حاصل کرتے رہے مگر صوفیاء و بار شاہی سے الگ تھلک رہ کر ملوکیت کے مفاسد بیان کرتے رہے۔

۱۵ - جب علماء بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے تاویلات میں مشغول تھے اس وقت

صوفیاء و شاہوں کو خوفِ خدا کا درس دیتے رہے۔

۱۶۔ معتزلہ، متکلمین اور حکماء نے اپنا وقت ذات و صفات کی بحثوں میں ضائع کیا، صوفیائے کہا کہ خدا کے بارے میں بحث فضول ہے۔ خدا منطق کے ذریعہ نہیں مل سکتا۔ آئینہ قلب کو صاف کر دنا کہ اس کا دیدار ہو سکے۔

۱۷۔ علماء نے دینی کتابیں لکھیں صوفیائے وہ آدمی تیار کئے جنہوں نے ان کتابوں کے احکام پر عمل کر کے انقلاب برپا کر دیا۔

۱۸۔ علماء و متکلمین، معتزلہ، حکماء نے صرف دماغ کی آبیاری کی صوفیائے دماغ کے

ساتھ ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیا اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام میں اصلی چیز دل ہے نہ کہ دماغ، اگر دل فاسد ہو جائے تو دماغ کا فائدہ ہو جاتا یعنی ہے۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”آگاہ ہو جاؤ انسان کے جسم میں ایک عضو ہے اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جائیگا اور اگر وہ صالح ہو جائے تو سارا جسم صالح ہو جائے گا اور وہ عضو قلب ہے۔“

۱۹۔ علماء نے مسلمانوں میں گروہ بندی کی صوفیائے انسانوں کو الخلق عیال اللہ کا درس دیا۔

۲۰۔ علماء نے دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا صوفیاء نے مشاہدہ باطنی کے

ذریعے سے اسلام کی صداقت واضح کی۔ لوگوں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ بشرِ حافی تو عالمِ دین نہیں ہیں پھر آپ ان کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے آگاہ ہوں مگر بشرِ حافی اللہ سے واقف ہیں اس لیے ان کا مرتبہ میرے مرتبے سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔

۱۔ تاریخ تصوف از پروفیسر یوسف سلیم چشتی : ۱۴۰۱ھ، ۱۴۰۲ھ، ۱۴۰۳ھ

روحِ تصوف

میں سید خورشید احمد صاحب گیلانی کی کتاب "روحِ تصوف" پر ابتدائی کلمات لکھتے ہوئے اپنے اندر خوشی و مسرت کی عجیب کیفیت محسوس کر رہا ہوں گیلانی صاحب ایک ایسے نوجوان فاضل ہیں جنہیں قدرت نے زبان و قلم کی بے شمار خوبیاں عطا فرمائی ہیں، ان سے اپنے پرانے روابط کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی موضوعات سے متعلق شاید ہی کوئی لائق اعتنا ایسی چیز ہو، جو ان کے مطالعے سے روکٹی ہو۔ گیلانی صاحب پر بھی ایک ایسا زمانہ گزر چکا ہے جو ہر ذہین اور حساس ذہن پر گزرتا ہے۔ مطالعے کی فراوانی، متضاد اور باہم دگر متضادم نظریات کے تقابلی جاننے کے ساتھ اگر قدرت نے نقاد ذہن بھی عطا کیا ہو تو ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں ذہن ہر چیز سے ہٹتی ہوئی لگتا ہے۔ غالباً یہی وہ مقام ہے جس کی طرف العلم حجاب الابر کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جس دماغ پر یہ کیفیت نہیں گزری وہ اسلام کے آفاقی پیغام اس کی رفعتوں اور لطافتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مجھے فخر ہے کہ اس عبوری دور میں میں نے جناب گیلانی صاحب کو صوفیا کے آفاقی پیغام محبت اور پیام رحمت و رافت کے مطالعے کی دعوت دی اور ان گزارش کی کہ مروجہ رسوم و رواج اور تنقیدی مواد کے بجائے اصل کتابوں کو دیکھا جائے۔ حسن اتفاق سے اس دوران میں انہیں حضرت قبلہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ ایسے حقیقی صوفی سے بھی تعارف حاصل ہو گیا، میری درخواست اور قبلہ حکیم صاحب کی صحبت بالآخر انہیں اس وادی میں کھینچ لائی جہاں عزالی جیسے ائمہ فلسفہ بھی اپنا سب کچھ ہار بیٹھے۔

جناب گیلانی صاحب مطالعے کے رسیا ہیں ان کے پاس وسیع ذاتی کتب خانہ

موجود ہے ان کا ماحول علمی ہے اور قدرت نے انہیں کام کرنے کا سلیقہ بخشا ہے۔
ان کی زیر نظر کتاب روح تصوف پڑھ کر ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں،
اس مادی دور میں ہر چیز کو سطحیت سے دیکھنے کی خوگر دینا کو انہوں نے انتہائی مؤثر
انداز میں دعوت دی ہے کہ وہ اسلامی تصوف کو بغور پڑھے۔ کتاب کا انداز بیان انتہائی
شگفتہ، زبان سلیس اور آوروں کے مقابلے میں آند ہے۔ عالمانہ مسائل اور پیچیدہ فنی
بحثوں سے اجتناب کیا گیا ہے، سچی بات یہ ہے کہ یہ کتاب ان تمام الزامات کا صفایا
کر دیتی ہے جو پچھلے کئی برس سے تصوف پر عائد کیے جا رہے ہیں۔ سیدھی بات
ہے کہ خود ائمہ تصوف ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ تصوف کی صحیح تعریف کریں اگر وہ
اس بات پر متفق ہیں کہ تصوف اسلام کی روح اور قرآن کی دعوت ہے، وہ اول تا
آخر قرآن اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہے تو پھر کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے
کہ وہ اپنی طرف سے صوفیاء پر الزامات لگا کر توجیہ القول بمالایضیٰ بہ قائمہ کا مرتکب ہو۔
البتہ ایک بات بطور خاص کشکی اور وہ یہ کہ تصوف کی بنیادی کتابوں کے
حوالہ جات کے لیے بعض دفعہ تراجم پر اکتفا کیا گیا ہے۔ گیلانی صاحب ایسے فاضل
انسان کے لیے جو براہ راست اصل مآخذ سے استفادہ کر سکتا ہے، تراجم پر انحصار کرنا
کیسے درست ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ تو یقیناً یہی ہے کہ وہ ترجمے کی ذمہ داری کا بوجھ
بھی اپنے اوپر ڈالنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ ان کی ثقہ تحریریں پڑھنے والے احباب کوئی
وجہ نہیں کہ ان کے ترجمے پر اعتماد نہ کریں۔ لیکن اگر وہ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو ضروری
تھا کہ وہ اصل عبارات دینے کے بعد تراجم کے سلسلے میں ذمہ داری کا بوجھ دوسروں پر
ٹالتے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے تراجم کے حوالے بھی موجود ہیں جن کے غیر ثقہ ہونے
پر ملک کے علمی حلقے متفق ہو چکے ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ بھی کمی پوری
کر دی جائے گی۔

مجموعی طور پر کتاب انتہائی خوبصورت، تحقیقی اور معیاری اور وقت کی ضرورت ہے۔ راقم السطور اس کتاب پر جناب سید خورشید احمد گیلانی کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔ اور توقع ہے کہ مستقبل میں وہ اپنی نگارشات سے بدستور علمی سرمارے میں اضافہ کرتے رہیں گے۔

سید محمد فاروق القادری ایم اے
آستانہ عالیہ شاہ آباد شریف
گڑھی اختیار خاں

۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ



پیش گفزار

خلافت سے ملوکیت کی طرف سفر کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں بٹ گئی۔ سیاسی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی جن کے شب و روز اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی تدبیروں میں بسر ہوتے اور جو مسلمانوں کی گردنوں پر بھجن اس بنا پر سوار ہو گئے تھے کہ ان کے پاس قبائلی عصبیتوں، مکارانہ چالوں اور قوت و دولت کا سرمایہ وافر مقدار میں تھا۔

وہ اپنے اقتدار کی شب و تاریک کو طول دینے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کی اہلیت رکھتے تھے، دھوکہ، فریب، عیاری، ہتکاری، ترغیب و تحریص، ظلم و ستم اور وحشت پر ہر بیت حتیٰ کہ ایمان فروشی بھی ان کے لیے فائدہ مند ہوتی تو اس سے دریغ نہ کرتے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جن کا سرمایہ معیات خدا خونی، صبر، توکل، تقویٰ، فقر، محاسبہ، تزکیہ، اخلاص، امانت، دیانت اور اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور انسانوں کی خدمت ان کی زندگی کا مشن تھا اور وہ اس سلسلے میں کسی کمزوری اور مہمت کا مظاہرہ نہ کرتے۔

انہیں اپنے اس مقصد سے کس قدر عشق تھا اس کی ایک مثال بت کدہ ہند کے تاریک ماحول میں روشنی پھیلانے والے بزرگوں کی وہ کوششیں ہیں جو انہوں نے کم پرتانہ معاشرے میں ظالمانہ و جاہلانہ حکمرانوں کی طرف سے رکاوٹوں کے باوجود جاری رکھیں اور جس کے

نتیجے میں یہاں کے چتے چتے پر اسلام کا نور پھیل گیا۔ ان لوگوں کی شبانہ روز محنتوں اور پاکیزہ روحانی زندگی سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ یہاں اسلام کی اشاعت کا کام اصلاً انہی بزرگوں کا کارنامہ ہے۔ فاتحین اور سلاطین تو ان کی کاشت کی ہوئی کھیتوں سے فائدہ اٹھاتے اور تاریخ میں اپنا نام لکھواتے رہے۔

قیادت کی یہ تقسیم عمل میں آئی تو مسلمانوں کے اجتماعی شعور نے زندگی کے مخصوص حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے بے مثال دانائی اور شاندار حکمت عملی کے ساتھ مؤخر الذکر قیادت کو اپنی اُمنگوں اور آرزوؤں کا منظر قرار دیا اور اول الذکر قیادت کے ذریعے اپنے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھا۔ یہ قیادت مملکت کا نظم و نسق چلانے اور حدود و تعزیرات کے نفاذ کا فریضہ انجام دیتی جبکہ روحانی قیادت اعمال و اخلاق کا وہ اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی جس کا مظاہرہ خلافت راشدہ کے دور میں ہوا تھا اور جسے سامنے رکھ کر مسلم امت اس کے دوبارہ قیام کے لیے ہر دور میں کوشاں رہی۔

مسلمانوں کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی قسم کی انار کی پھیلائے بغیر وہ مقاصد حاصل کر لیے جو کسی نظام کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک طرف تو بڑے بھلے سیاسی ڈھانچے کو برقرار رکھ کر تاریخی تسلسل مجروح نہ ہونے دیا اور دوسری طرف اس اجتماعی شعور نے قیادت کے اعلیٰ ترین معیار کا خاکہ بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ مسلمانوں کے دل صرف ان لوگوں کے آگے جھکے جن کی زندگی اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عبارت تھی اور جو قیادت کے اس اعلیٰ ترین معیار پر پورا اترتے تھے، جس کا نقشہ مسلمانوں کی آنکھوں میں رچا بسا ہوا تھا۔

یہ دوسری قسم کی قیادت جن لوگوں پر مشتمل تھی ان کے پاس نہ کوئی سلطنت ہوتی اور نہ سرکاری عہدے۔ حتیٰ کہ یہ لوگ اکثر اوقات رعایا کے عام افراد سے بھی بڑھ کر تنگ دست اور مغلوک الحال ہوتے لیکن ان کے اقتدار کا دائرہ بہت وسیع تھا، انسانی دل و دماغ پر حکومت

کرنے والے یہ لوگ بیک وقت لاکھوں کروڑوں انسانوں کے مرجع عقیدت ہوتے اور بڑے بڑے فرعون صفت سلاطین و حکمران ان سے خوف محسوس کرتے۔

یہی لوگ تھے جن کی مجلسوں اور خانقاہوں میں حاضری دینے والے افزو بڑے بڑے بکھلاہوں کو خاطر میں نہ لاتے اور جہاں محمود و یازانیک ہی صفت میں کھڑے نظر آتے۔
حضرت حسن بصریؒ، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ، حضرت معین الدین اجمیریؒ، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین دہلویؒ اور اس طرح کے دوسرے صوفیاء کرام اپنے اپنے عہد میں قیادت کے اُس منصب پر فائز نظر آتے ہیں جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں۔ یہ حضرات اُمت کی عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز تھے اور ان کے اعمال و اخلاق لوگوں کے لیے لائق تقلید۔

اسلام کے عالمگیر پیغام سے انسانیت کو روشناس کرانے اور اسلام کی عالمگیر اور ابدی سچائیوں کو انسانی اذہان میں راسخ کرنے کے لیے جو کارنامہ ان بزرگوں نے انجام دیا اور نبوی طریقے کے مطابق کہنے سے زیادہ کر گزرنے اور بتانے سے زیادہ عملی نمونہ پیش کرنے کی جو تکنیک ان صوفیاء نے اختیار کی اس کی ایک جھلک ”روح تصوف“ میں ملتی ہے جسے عزیز محترم سید غور شید احمد گیلانیؒ نے بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔

”روح تصوف“ جن خوبیوں کا مرقع ہے اس کا اصل اندازہ تو کتاب کے مطالعے سے ہو گا لیکن فقیر کی ناقص رائے میں :

۱۔ فاضل مصنف نے کمال خوبی سے فنی اصطلاحات اور نظری مباحث میں اُبجھے بغیر صوفیہ کرام کے اصل کارناموں اور ان کی تعلیمات کو شگفتہ انداز میں پیش کر دیا ہے اس سے ایک طرف تو قاری کو کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی سہولت حاصل ہو گئی ہے اور دوسری طرف وہ اکتاہٹ بھی محسوس نہیں کرتا۔

(۲) فاضل مصنف چونکہ تصنیف و تالیف کے جدید تقاضوں سے بھی واقف ہیں اور اُن کا ذوق مطالعہ قدیم موضوعات کے علاوہ عصری مسائل و تحریکات کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے اس لیے ”روح تصوف“ کو انہوں نے حوالوں کا مجموعہ نہیں بننے دیا بلکہ مناسب مواقع پر تجزیئے اور تبصرے کی زبان استعمال کی ہے اور ایک کامیاب تجزیہ نگار کی طرح اپنے موضوع سے انصاف کر گزرے ہیں۔

” تصوف مسائل کا حل “ کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

” تصوف کا دعویٰ ہے کہ خدا سے بے خوفی نے معاشرتی مشکلات کو جنم دیا ہے۔ مثلاً جھوٹ، غداری، قتل، فساد، بد امنی، قانون شکنی، ظلم، دنیا کی رغبت نے معاشی مسائل پیدا کیے ہیں۔ مثلاً ہوس زر، ذخیرہ اندوزی، چور بازی، حب جاہ، سرمایہ پرستی، شکم پروری اور نفس پرستی وغیرہم۔ آج مدیرین عالم اکیڈمیاں قائم کرنے، کمیٹیاں بنانے، مجلسیں بٹھانے، اجلاس بلانے، تحقیق کرنے، فلسفے مرتب کرنے، طریق کار تجویز کرنے اور لائحہ عمل تیار کرنے کے بجائے ان دو باتوں کو اپنی روح کے ساتھ عام کر دیں تو یہ مسائل اپنی موت آپ مر جائیں۔ تصوف کی خانتقاہوں نے غریبوں کو نفیس و لطیف دسترخوانوں پر بٹھایا اور امیروں کو روکھی روٹی اور سوکھی دال سے آشنا کیا اور دونوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف کدورت و نفرت ادا نہ خود تجویز کردہ معاشی و معاشرتی بُعد کا خاتمہ کر دیا، آج وہی تصوف کیونرم کا مقابلہ نہیں کر سکتا؟ تصوف کے جن اداروں نے ہوا و ہوس کے بندوں کو ایک خدا کی بندگی پر لگا دیا۔ آج وہ طہنیت اور قومیت کے ثبوت نہیں توڑ سکتا اور خدا سے رشتہ نہیں جوڑ سکتا۔“

تصوف کے اداروں کی وجہ قیام یوں بیان کی گئی ہے،

marfat.com

Marfat.com

تصوف کے ادارے دراصل اس وقت وجود میں آئے جب علم، علماء کے ذہنی تعیش کا ذریعہ اور وعظ و نصیحت کے بجائے دوسرے کو نیچا دکھانے کا ہتھیار بن گیا تھا! غلط و معروف تھے مگر مفہوم و معنی سے یکسر غالی، عباد و نباد اور اد و وظائف میں مشغول تھے لیکن ان کی روح سے نا آشنا، حکمرانی کا ڈھانچہ اسلامی کہلاتا مگر دنیا کی رغبت اور حبِ جاہ نے قوانین کو بازیچہ اطفال اور حکومتی اور دل کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ قال اقوال کی فضائیں اور حق ہو کی صدائیں نہ کسی کے ذہن کا رنگ آثار میں اور نہ کسی کے سائیدل کے تار ہلاتیں۔ تصوف نے اگر اس روح کو بیدار کرنے پر زور دیا جو علم کو با مقصد، ذہد کو نتیجہ خیز، حکومت کو خادمِ خلق اور تعلیم و تدبیر کو سرگرم بنا دے۔ کہا جاتا ہے کہ تخت سلطنتِ فاسقوں کے ہاتھ میں رہا مگر موفیاء مراقبوں میں مست رہے۔ اٹھ کر ٹوکا نہیں، تحریک کیوں نہیں چلائی۔ لوگوں کو آگسٹیا کیوں نہیں جذبات کو بھڑکایا کس لیے نہیں؟ یہ ساری باتیں بجا مگر ان کا حاصل کیا؟ یہی ناکہ ایک ہٹا دہ سرا بیٹھا نام بدل گیا، کام وہی رہا۔ انہوں نے سوچا کاشا ہی کیوں نہ بدل دیا جائے جو صحیح طریقہ ہے گاڑی کو پٹری پر ڈالنے کا؟

فاضل مصنف کا دعویٰ ہے کہ صوفیہ نے معاشرے کی ناہمواریوں اور حکمرانوں کی غلط کاریوں کے خلاف ہنگامہ آرائی کے بجائے عملی احتجاج کا انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ لکھتے ہیں:

”آج مجاہدِ دین اور صوفیہ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ بے گھر چھوڑ کر جنگلوں میں جا بیٹھے، خدا کے دیئے ہوئے رزق سے منہ موڑ کر تپوں پر گزارا کیا، خدا کے عطا کردہ پہناوے کو لنگوٹی یا پیوند لگے خرقے میں بدل دیا۔ خدا داد صحت کو سخت ریاضت کر کے برباد کر ڈالا اور کہتے کہتے تالو خشک ہو جاتے ہیں کہ یہ کہاں کی ولایت ہے، یہ کیسی بندگی ہے، یہ کس طرح کا تصوف ہے؟ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے یوں تنقید اور تشنیع کے اڑنگے پر رکھا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ سراپا احتجاج تھے، معاشرے کی بے انصافی پر، لوگوں کی بے حسی پر، حکمرانوں کی کوتاہیوں پر اور وہیوں لوگوں

کو۔ معاشرے اور حکمرانوں کو دعوت دے رہے تھے کہ ہمیں سادہ و اور دہیان بن کر گھر بار چھوڑ دینے کا طعنہ دینے والو، ہزاروں، لاکھوں لوگ ہیں جو بے گھر ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے گرمیوں میں گھل اور سردیوں میں ٹھٹھک رہے ہیں، انہیں تم نے چھتیں مہیا کر دی ہیں کہ ہماری فکر تمہیں لاحق ہو گئی ہے؟ مہو کے پیاسے رہ کر خدا کی ناشکری کا الزام دینے والو! لاکھوں خلق خشک اور پیٹ خالی ہیں جو پانی کے گھونٹ اور روٹی کے لقمہ کو ترس گئے ہیں۔ کیا انہیں آب و دانہ مہیا کر دیا گیا ہے کہ ہم مود الزام ٹھہرائے جائیں؟ ہمارے خرقہ پوش بننے پر عین برہیں ہونے والو۔ لاکھوں ننگے بدن پر عین طلب ہیں، انہیں ڈھانپنا مل گیا ہے کہ ہماری خرقہ پوشی تمہیں کھشک رہی ہے؟

کاش لوگ ان مجاذیب اور صوفیاء کے دلوں کی تپش اور روح کی لرزش کو دیکھ سکتے؟ تو سمجھ پاتے، صوفیاء نے کہہ کر یا لکھ کر نہیں بتایا، کر کے دکھایا اور زندگیاں بدل دیں۔ صوفیاء کا دنیا پر احسان ہے کہ انہوں نے لہا موڑ کانٹ کر منزل پر پہنچانے کے بجائے سیدھا راستہ اختیار کر کے مسافت کو کم کر دیا ورنہ ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگ کارواں سے بچر جاتے، بعض راستے کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے اور بعض کیس اتھاہ کھڑوں میں لڑھک جاتے۔ یہ بات دیکھ کر صوفیاء کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ انبیاء کرام کی جانشینی کے مستحق اگر ہیں تو یہی صوفیاء کرام۔ کیونکہ انبیاء کرام نے بھی تو انسان کی محنت کو کم کر دیا ہے؟

اسی طرح کے طرز استدلال اور تجزیاتی انداز نے کتاب کو دلچسپ اور اپنے موضوع کی مناسبت سے انتہائی وقیع بنا دیا ہے۔

(۳) فاضل مصنف چونکہ خود بھی دین کا گہرا شعور اور شریعت کی پاسداری کا دافر جذبہ رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے کھلے ذہن کے ساتھ تصوف میں ورنے والی خرافات کی تردید کی ہے اور اجل صوفیاء کے حوالے سے تصوف کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔

(۴) ”روح تصوف“ میں تصوف کی اہمات کتب کے تفصیلی تعارف کے علاوہ فقرا

توکل، قناعت وغیرہ ایسے عنوانات کے تحت قاری کی ذہنی تربیت کا مواد ملتا ہے۔
 بلاشبہ یہ کتاب تصوف کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالے کی ایک کامیاب
 کوشش ہی نہیں، دعوت و تبلیغ کے نقطہ نظر سے بھی ہر طرح سے افادیت کی حامل ہے۔
 (۵) مصنف کا خطاب چونکہ مسائل کے بارے ہوئے عام انسانوں سے ہے۔ اس
 لیے انہوں نے کتب تصوف سے عبارتیں نقل کرتے ہوئے عربی، فارسی کے اصل متن کے
 بجائے صرف اردو ترجمے پر اکتفا کیا ہے جو تحقیقی نقطہ نظر سے تو یقیناً محل نظر ہے لیکن دعوت
 و تبلیغ کے نبوی انداز سے انتہائی قریب ہے مقصد اپنے علم و قابلیت کا اظہار نہیں بلکہ سلیم
 الطبع قارئین کو نظام خانقاہی اور تصوف سے روشناس کرانا ہے۔
 (۶) ”روح تصوف“ میں زبان و بیان کی نزاکتوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جو بجائے خود
 لائق تحسین امر ہے۔

ان خوبیوں کے پیش نظر یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عزیز محترم سید
 خورشید احمد گیلانی کی یہ علمی کاوش علمی اور دینی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرے گی۔
 فرید بک شال کے کارپردازان مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی بہترین کوششوں کے
 طفیل ”روح تصوف“ خوش ذوق قارئین کے ہاتھ پہنچ رہی ہے۔

شکارپور راجن پور، ضلع ڈیرہ غازی خان

سید ارشاد احمد عارف

رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ

مدیر مہ ماہی ”عارف“ لاہور

روحِ تصوف

غلط فہمیوں کے ماحول میں کسی چیز کا اپنے اصل روپ میں سامنے آنا کسی قدر مشکل ہے اور جب تک گرد کی جھٹی نہیں الگ کر کے اصل مآخذ کا مطالعہ نہ کیا جائے حقیقت کیونکر واضح ہو سکتی ہے، اس کا احساس تصوف کے بارے میں غلط العوام تاثر کا جائزہ لیتے ہوئے ہوتا ہے، تصوف کی غلط تعبیر، خود ساختہ تشریح اور من پسند توجہ دے غلطیوں مضامین کا دور واپس آکر نام نہاد صوفیا کا طرز عمل اونٹ کی کمر پر آخری تشکا ثابت ہوا، ورنہ رنگین شیشوں والی عینک کے بغیر تصوف کا مطالعہ کیا جائے تو آج کے مروجہ اور مثبت تصوف سے اصل تصوف نہ صرف الگ نظر آتا ہے بلکہ کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا کہاں وہ تصوف اور کہاں یہ رسم درواج، ہر گروہ میں کالی بھٹیں ہوتی ہیں۔ تصوف کا اوارہ بھی اس سے محفوظ نہ رہا، مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ذرا سی کوتاہی پر سب کچھ قابل تنسیخ قرار دے دیا جائے، تنقید کی سانہ متنی تیز ہو، پھر بھی اس قدر بے رحمی سراسر زیادتی ہے کہ درست اور نادرست میں تمیز ہی اٹھ جائے۔

ظاہر اور باطن کی اصطلاح سے ہر فرد واقف ہے، تعلیم اور تزکیہ کو بھی جو فرائض نبوت میں سے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے، بس اسی تزکیہ اور تصوف کا نام باطن ہے جس طرح دیگر علوم و فنون مثلاً صرف، نحو، فقہ، منطق، فلسفہ اور معانی کا نام رکھنے سے ان کا شریعت سے متغائر اور مقصود ہونا لازم نہیں آتا بلکہ اسے علم کی ذیلی شاخیں کہا جاتا ہے۔

اسی طرح تصوف کو ایک مستقل ادارے اور باضابطہ تحریک کا نام دینے سے بھی شریعت سے علیحدگی اور تضاد ثابت نہیں ہوتا۔ بعض باتیں اعتقاد اور جوارح سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض دل اور روح سے، دل اور روح سے متعلق امور کو تصوف کہا جاتا ہے یہ کوئی ایسی خطرناک بات نہیں جس پر شعلہ پا ہوا جائے۔ بعض احکام ظاہر سے متعلق ہوتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا مثلاً نکاح، طلاق، بیع و شراء، حقوق الزوجهین، قرضہ، رہن، لین وین، پیروی مقدمات، شہادت، وصیت، تقسیم ترکہ، اور جیسے سلام و کلام، قنود و قیام، طعام و منام، مہمانی و میزبانی وغیرہ ان مسائل کو فقہ کہتے ہیں اور کچھ احکام باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے خدا سے محبت رکھنا کہ خالص دل کا معاملہ ہے، خدا سے ڈرنا، دنیا سے کم رغبتی، خدا کی مشیت پر راضی رہنا، حرص نہ کرنا، دین کے کاموں کو اخلاص سے کرنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پست نہ ہونا، غصہ کو ضبط کرنا وغیرہم ان اخلاق کو سلوک یعنی تصوف کہتے ہیں، بس یہ ہے تصوف جو ہدف تنقید بنا ہوا ہے اور اسے تو ابنا دیا گیا ہے، آج دنیا جن معاشرتی اور معاشی مسائل میں الجھی ہوئی ہے اور ہزاروں لاکھوں صفات اس کے حل کے لیے سیاہ اور بیش قیمت ذہنی و عملی قوت صرف کی جا رہی ہے۔ اسے دو باتوں کا علم ہو جائے اور تباہی کے کنارے پہنچی دنیا امن و عافیت کا سانس لے اور یہی دو باتیں تصوف کا اصل الاصول ہیں۔ ۱: خدا کا خوف اور دنیا سے بے رغبتی خدا کے خوف سے یہ فائدہ کہ ہر شخص میں جواب دہی کا احساس زندہ و موجود رہتا ہے اور دنیا سے بے رغبتی کا حاصل یہ کہ انسان کے اندر حرص، طمع، فساد اور ہوس کے جذبات سر دپڑ جاتے ہیں جو تمام معاشرتی اور معاشی مشکلات کا باعث ہیں۔

تصوف نے یہ علاج ان مسائل کی صحیح تشخیص کے بعد تجویز کیا ہے، تصوف کا دعویٰ ہے کہ خدا سے بے خوفی نے معاشرتی مشکلات کو جنم دیا ہے مثلاً جھوٹ، غداری، قتل،

فساد، بد امنی، قانون شکنی اور ظلم و غیر ہم اور دنیا کی رغبت نے معاشی مسائل پیدا کیے ہیں مثلاً ہوس نر، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، حب جاہ، سرمایہ پرستی، شکم پرری اور نفس پرستی وغیرہم آج مدیرین عالم اکیڈمیاں قائم کرنے، کمیٹیاں بنانے، مجلسیں بٹھانے اجلاس بلائے، تحقیق کرنے، فلسفے مرتب کرنے، طریق کار تجویز کرنے اور لائحہ عمل تیار کرنے کے بجائے ان دو باتوں کو اپنی روح کے ساتھ عام کر دیں تو یہ مسائل اپنی موت آپ مر جائیں تصوف کی جن خانقاہوں نے غریبوں کو نفیس و لطیف دسترخوان پر بٹھایا اور امیروں کو روکھی روٹی اور سوکھی دال سے آشنا کیا اور دونوں کے دلوں سے ایک دوسرے کی کدورت و نفرت اور از خود تجویز کردہ معاشی و معاشرتی بُد کا خاتمہ کر دیا، کیا آج وہی تصوف کیونرم کا مقابلہ نہیں کر سکتا؟ تصوف کے جن اولیوں نے ہوا و ہوس کے بندوں کو ایک خدا کی بندگی پر لگا دیا، آج وہ وطنیت اور قومیت کے بُت نہیں توڑ سکتا اور خدا سے رشتہ نہیں جوڑ سکتا؛ اخلاق سے تہی دست دنیا آج بھی تصوف کو اس کی صحیح روح کے ساتھ اپنا لے تو اس کے جملہ اخلاقی مسائل چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تصوف کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کر کے اس سے مزاج کی نسبت پیدا کی جائے، یہ الگ بات ہے کہ تصوف اپنے دور انحطاط میں اتنا کچھ بدل گیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا کسی صاحبِ دل کے صحیح تر الفاظ میں:-

”تصوف حال تھا لیکن اپنے دور انحطاط میں برا حال بن گیا وہ اعتبار تھا لیکن اب اس نے کتاب کی صورت اختیار کر لی وہ استعارہ یعنی پردہ تھا لیکن اب وہ اشتہار نظر آنے لگا، پہلے وہ صدور کی عمارت تھا اب وہ غرور کا مرکز بن گیا، پہلے وہ نقشب تھا اب تکلف کا جامہ اس نے پہن لیا، پہلے وہ تخلق تھا اب وہ تلق بن گیا، پہلے وہ قناعت

تھا اب اس نے حرص کا روپ دھار لیا۔

تصوف کے ادارے دراصل اس وقت وجود میں آئے جب علم علماء کے ذہنی تعیش کا ذریعہ اور غفلت نصیحت کے بجائے دوسرے کو نچا دکھانے کا ہتھیار بن گیا تھا۔ الفاظ و حروف تھے۔ مگر مفہوم و معنی سے یکسر خالی، عبادتِ باہر اور ادو وظائف میں تو مشغول تھے، لیکن ان کی روح سے نا آشنا، حکمرانی کا ڈھانچہ اسلامی کہلاتا تھا۔ مگر دنیا کی غربت اور حبِ جاہ نے قوانین کو باز کھینچ اٹھا اور حکومتی اداروں کو کھوکھلا کر دیا تھا، قال اقول کی فضائیں اور حق ہو کی صدائیں نہ کسی کے ذہن کا رنگ تھاتیں اور نہ کسی کے ساز دل کے تار ہلاتیں۔ تصوف نے اگر اس روح کو بیدار کرنے پر زور دیا جو علم کو با مقصد، زہد کو نتیجہ خیز، حکومت کو خادمِ خلق اور تعلیم و تدریس کو سرگرم بنادے، کہا جاتا ہے کہ تخت سلطنت نااہلوں کے ہاتھوں میں رہا مگر صوفیاء مراقبوں میں مست رہے اٹھ کر ٹوکا نہیں، تحریک کیوں نہیں چلائی، لوگوں کو اکسایا کیوں نہیں، جذبات کو بیڑ کا یا کس لیے نہیں؟ یہ ساری باتیں بجا، مگر ان کا حاصل کیا؟ یہی ناکہ ایک ہٹا دوسرا بیٹھا، نام بدل گیا کام وہی رہا۔ انہوں نے سوچا کاٹھا ہی کیوں نہ بدل دیا جائے جو صحیح طریقہ ہے گاڑی کو صحیح سڑی پر ڈالنے کا! اس وقت حکومت کے نظام میں باقاعدہ شوری ہوتی تھی، عدلیہ کا وجود قائم تھا، قاضی اور منصف ہوتے، محاصل کا منظم اداں تھا سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو خدا کا خوف اور جوابدہی کا احساس نہیں تھا۔ جو جڑ ہے تمام اخلاق حسنہ اور اعمال صادقہ کی، یہ نہ ہو تو شکل خواہ کیسی بھی ہونی نتیجے کے اعتبار سے صفر ہوتی ہے۔

آج صوفیاء اور مجازیب کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ بے عملی احتجاج | گھر چھوڑ کر جنگوں میں جا بیٹھے، خدا کے دیے رزق سے منہ موڑ کر پتوں پر گزارا کیا خدا کے عطا کردہ پناہ سے کو لنگوٹی یا سونڈ لگے، خرچے میں بدل دیا۔ خدا اور محنت کو محنت ریاضت کر کے برباد کر ڈالا، اور کتے کتے تالو خشک ہو جاتے

ہیں کہ یہ کہاں کی ولایت ہے؛ یہ کیسی بزرگی ہے؛ یہ کس طرح کا تصوف ہے؟ ہمارے
 اگر غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے یوں تنقید اور تشنیع کے رنگ
 پر رکھا جائے، اصل بات یہ ہے کہ صوفیاء سراپا احتجاج تھے، معاشرے کی بے نقصانی
 پر، لوگوں کی بے حسی پر، حکمرانوں کی کوتاہی پر، اور وہ یوں لوگوں کو، معاشرے اور حکمرانوں
 کو دعوت دے رہے تھے کہ ہمیں سادہ اور رہبان بن کر گھر بار چھوڑ دینے کا طعنہ دینے
 والو، ہزاروں، لاکھوں لوگ ہیں جو بے گھر ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے گرمیوں میں لگیں
 اور سردیوں میں ٹھٹھہر گئے ہیں۔ انہیں تم نے چھتیں مہیا کر دی ہیں کہ ہماری فکر تمہیں لاحق
 ہو گئی ہے؛ بھوکے پیاسے رہ کر خدا کی ناشکری کا الزام دینے والو، لاکھوں جلن منگ
 اور لاکھوں پیٹ خالی ہیں جو پانی کے گھونٹ اور روٹی کے لقمے کو ترس گئے ہیں، کیا
 انہیں آب و دانہ مہیا کر دیا گیا ہے کہ ہم مورد الزام ٹھہرائے جائیں؛ ہمارے خرقہ پوش
 بھنے پرچین بھین ہونے والو لاکھوں ننگے بدن پر من طلب ہیں۔ انہیں ڈھانپا مل گیا
 ہے کہ ہماری خرقہ پوشی تمہیں کٹھک رہی ہے؛ کاش لوگ ان مجاذیب و صوفیاء کے
 دلوں کی تپش اور روحوں کی لہزش دیکھ سکتے، سمجھ پاتے، صوفیائے کرم کو یہ کہہ کر نہیں
 بتایا کر کے دکھایا اور زندگیاں بدل دیں، صوفیاء کا دنیا پر احسان ہے کہ انہوں نے لمبا
 موڑ کاٹ کر منزل پر پہنچانے کے بجائے سیدھا راستہ اختیار کر کے مسافت کو کم کر دیا
 ورنہ ہو سکتا تھا کچھ لوگ کارواں سے بچھڑ جاتے، کچھ تھک ہار کر بیٹھ جاتے، بعض راستے
 کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے اور بعض کہیں اتھاہ کھڈوں میں لٹک جاتے، یہ بات
 دیکھ کر صوفیاء کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ انبیاء کی جانشینی کا اگر کوئی مستحق ہو سکتا
 تھا تو یہی صوفیاء تھے کیونکہ انبیاء نے بھی تو انسان کی محنت کو کم کر دیا ہے، ڈھانچہ پڑا
 تھا صوفیاء نے روح پھونک دی۔ جسم موجود تھا صوفیاء نے جان ڈال دی اور وہ دہیں
 سے چلنے کے قابل بن گیا۔ کون کہتا ہے۔ صوفیاء دنیا کے ہنگاموں اور زندگی کی سرگرمیوں

سے دور تھے، کس نے کہا ہے کہ صوفیاء نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی تعلیم نہیں دیتے تھے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ صوفیائے تعلیم و تعلم کو خیر باد کہہ دیا؟ ہاں البتہ وہ دنیا کو سلجھانے میں سرگرم تھے مگر الجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مرغابی کی طرح غوطے تو کھاتے تھے مگر پال و پر آلودہ کرنے پر آمادہ نہ تھے، اُن کے ہاں بھی نماز تھی، روزہ تھا، حج تھا، زکوٰۃ تھی، اور جہاد تھا۔ مگر وہ پانچ وقت کی نماز کے ساتھ ساتھ پوری زندگی کو نماز بنانے کا داعیہ رکھتے تھے وہ صرف پانچ وقت خدا کے ہاں حاضر ہونے پر ہی نہیں ہمہ وقت خدا کے ہاں حاضری پر زور دیتے تھے۔ وہ نہ کدّرخ کعبہ کی جانب موڑنا کافی نہ سمجھتے تھے جب تک دل رب کعبہ کے آگے نہ جھک جاتا، وہ حفاظ کی ادائیگی کو ضروری جانتے تھے لیکن معافی کو دل میں اماننا اس سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے تھے، روزہ اُن کے ہاں بھی تھا مگر صرف یہ نہیں کہ پیٹ کو روٹی اور پانی سے خالی رکھا جائے بلکہ دل کو دھما و خرافات سے بھی خالی رکھنا ضروری تھا، وہ صرف دن بھر منہ پر تالا لگانا لازمی نہ سمجھتے بلکہ ہر وہ سوتا بند کر دیتے جہاں سے شیطان کچھ بھی داخل کر سکے۔ وہ ایسے روزے کو کوئی اہمیت نہ دیتے جس کا نتیجہ ضبط نفس کی صورت میں نہ نکلے وہ ایسی بھوک پیاس کو پسند نہ کرتے جو کسی بھوکے پیاسے کی بھوک پیاس کا احساس پیدا نہ کرے، وہ صرف پیٹ کے روزے کے قائل نہ تھے، وہ زبان، آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں اور دماغ کا بھی روزہ رکھتے تھے، زکوٰۃ کو بھی وہ فرض جانتے تھے مگر دھائی فیصد پر ہی قناعت نہ کر بیٹھتے اُن کے ہاں سب کچھ دے دینا زکوٰۃ تھا اور پھر یہ کہ تجوری سے سکوں کا نکال دینا ہی اصل زکوٰۃ نہ سمجھی جاتی، جب تک دل کے نہاں خانوں سے حب مال و زر کو واپس نکالا نہ مل جاتا، زکوٰۃ سے مال پاکیزہ ہوتا ہے وہ دل کی پاکیزگی کو اس سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے حج کے لیے وہ بھی جاتے، مگر مقصود صرف کعبہ کا دیدار نہ ہوتا بلکہ رب کعبہ کی ملاقات کو اولیت دیتے، کعبے کے کوٹھے کا طواف ہی کافی نہ سمجھتے وہ تو خدا کے حکم پر پروا نہ دار

جھومنے کو روح جج بھتے تھے، منی میں منڈھے کی قربانی سے آگاہ تھے لیکن نفس لعیم کا ذبح کرنا ان کے نزدیک فرضِ اولین تھا، عرفات میں حبسوں کے اجتماع کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے روحانی اور قلبی ملاپ کے وہ علمبردار تھے، جہاد کا مفہوم وہ جانتے تھے مگر صرف اتنا ہی نہیں کہ میدانِ جنگ میں تلوار سے لڑا جائے بلکہ وہ تو نفس اور شیطان کے ساتھ جہاد کو ”جہاد اکبر“ کا نام دیتے تھے وہ جہاد کو ماستے اور جانتے ہوئے بھی خواہشِ نفس سے لڑنے کو جہاد کی معراج کہتے تھے۔

علم، سوز و ماغ یا سوزِ جگر | صوفیاء کے ہاں تعلیم و تعلم کا چرچا رہا ہے، لیکن وہ علم کو یقین کے معنوں میں لیتے تھے، ان کے ہاں سوز و ماغ اور ”سوزِ جگر“ میں واضح فرق تھا۔ وہ علم سے صرف و ماغ ہی نہیں جلاتے بلکہ اپنا سرخ پاتے تھے، انہوں نے علم کو انفاظ کی شعبہ بازی ہرگز نہ بننے دیا، وہ علم کو تن پر مارنے کی بجائے من پر مارنے کو مقدم جانتے تھے، ان کے ہاں صرف ہدایہ کی عبارت خوانی کافی نہ تھی۔ ہدایت ”اصل مقصد تھا، وقایہ کی ورق گردانی سے کہیں اہم“ ”تعموی“ تھا، وہ کنز، قدوری کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کے بجائے ”کتابِ دل“ پڑھنے پر زور دیتے تھے۔ وہ علم کے نخل ہونے کے قائل تھے مگر یقین کے بغیر اسے بے رطب گردانتے تھے، انہیں علم کے ”یاد اور تاد“ ہونے سے پوری واقفیت تھی۔ علم کے ”حجۃ اللہ علی ابن آدم“ سے مکمل باخبر تھے۔ ان کا عقیدہ علم کے منزل نہیں چراغِ راہ ہونے پر تھا۔ وہ ”مکتب کی کرامت“ کے قائل ہوتے ہوئے بھی ”فیضانِ نظر“ کی طرف مائل رہے، الغرض زندگی کے ہر شعبے سے صوفیاء کو تعلق رہا، پولیسی رہی، مگر دل کو کھینے نہ دیا پھینے نہ دیا۔ وہ دنیا میں شاغل ضرور رہے، لیکن رب سے غافل نہ ہو سکے، مخلوق کی جانب مائل تو رہے۔ مگر اللہ کے ساتھ اصل بھی رہے۔ بس یہ تھا ان کا ترک، تجسس و ادب، انقطاع، اگر یہ سب کچھ خلافِ شرع ہے تو بتایا جائے کہ دین کی روح کیا ہے؟

تصوف کیا بن گیا ہے۔ سب سے پہلے ”تصوف کیا تھا“ کو جان لیا جائے تو بہتر ہے۔ ہم ان ادراک میں بس اسی ایک بات کو بیان کرتے ہیں، اپنی طرف سے کچھ بھی نہ ہوگا بیان ہوگا ان صوفیاء کا جنہیں تصوف کے ”امام“ کا منصب حاصل ہے اور حوالہ ہوگا، ان کتابوں کا جو تصوف کی ”اہمات کتب“ کہلاتی ہیں، لیکن سب سے پہلے ہم اس حدیث کی تشریح کریں گے جو ”حدیث جبریل یا حدیث احسان“ کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے الفاظ ہیں۔ اس حدیث میں جناب جبریلؑ نے ایک اعرابی کی شکل میں صحابہ کرامؓ کی تفہیم و تعلیم کے لیے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں استفسار کیا تھا، اس حدیث کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے، اشعۃ اللمعات میں شیخ فرماتے ہیں:-

”جان لو کہ دین اور اس کے کمال کی بنیاد فقہ، کلام اور تصوف پر ہے۔ اس حدیث نے ان تینوں مقاموں کا بیان کر دیا، اسلام کا یہ اشارہ فقہ کی طرف ہے جو اعمال و احکام شرعیہ کے بیان کا متکفل ہے اور ایمان، یہ اشارہ اعتقادات کی طرف ہے جو کہ علم اصول (کلام) کے مسائل ہیں اور احسان اشارہ اصل تصوف کی طرف ہے جس سے مراد خدا کی طرف صدق توجہ ہے، تصوف کے تمام معانی جن کی طرف تمام مشائخ طریقت نے اشارہ کیا ہے اسی معنی کی طرف راجع ہیں، فقہ، کلام اور تصوف لازم و ملزوم ہیں، کہ ایک دوسرے کے بغیر ان میں سے کوئی کامل نہیں ہوتا کیونکہ فقہ بغیر تصوف کے اور تصوف بغیر فقہ کے صورت پذیر نہیں ہوتا اس لیے کہ کلام الہی بغیر فقہ کے پیمانہ نہیں جاتا اور فقہ بغیر تصوف کے کامل نہیں کیونکہ عمل بغیر صدق توجہ کے تمام کامل نہیں ہوتا اور یہ دونوں بغیر ایمان کے صحیح نہیں ہوتے جس طرح کہ روح و جسم ایک دوسرے کے بغیر وجود و کمال انتہائی

نہیں کرتے اسی واسطے امام مالکؒ نے فرمایا ”جو شخص صوفی بنا اور فقیہ نہ ہوا
وہ زندیق ہو گیا“ اور جو فقیہ بنا اور صوفی نہ ہوا، وہ فاسق ہو گیا اور جو دونوں کا
جامع ہو وہ بے شک محقق بن گیا۔ کمال جامعیت یہی ہے۔“

تصوف کیا ہے؟ یہی کچھ ہے جو اوپر بیان ہوا نہ اس سے زیادہ نہ کم اور کسی شخص کو
تصوف کی اس تشریح و تعبیر پر کوئی اعتراض کیوں کر ہو سکتا ہے؟ تشریح و تعبیر کرنے والا
”مرج البحرین“ شخصیت کا حامل ہے۔ یعنی علوم عقلیہ و نقلیہ کا جامع ہے اور حسن اتفاق
کہ کتاب ”مرج البحرین“ کا مصنف بھی ہے، لطف برآں یہ کہ شیخ محقق تصوف کے
اصولی وکیل اور شارح نہیں بلکہ اس میدان کے مرد ہیں، انہوں نے تصوف کو پڑھ کر
یا کتابوں سے دیکھ کر ہی نہیں پرکھا۔ بلکہ اس میں غوطہ زن ہو کر جانچا اور اپنی رائے پیش کی جو
اوپر نقل کی گئی ہے یہی بات ان کے معاصر اور برصغیر پاک و ہند کی قد آور روحانی و سیاسی
شخصیت شیخ احمد سرمدی المعروف مجدد الف ثانیؒ نے بھی اپنے الفاظ میں پیش کی ہے
شیخ مجددؒ بھی شیخ محقق کی طرح تصوف کے مزا آشنا اور اداس شناس تھے شیخ مجددؒ
اپنے ایک رسالے حقیقت تصوف کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

”شرعیات کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے وہ
دو قسم کے ہیں بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے۔ جیسے
کلمہ پڑھنا، نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ، والدین کی خدمت وغیرہم ان کو مامورات
کہتے ہیں اور کلمات کفر کینا، شرک کے افعال کرنا، زنا، چوری، سود، رشوت،
وغیرہ ان کو منہیات کہتے ہیں، بعض اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق باطن سے
ہے، جیسے ایمان و تصدیق، عقائد حقہ، صبر و شکر، توکل رضا، اخلاص
محبت خدا اور رسول ان کو مامورات و فضائل اور عقائد باطلہ، بے صبری،
ناشکری، ریاء و عجب، تکبر، یہ منہای و ذائل ہیں، جس طرح قرآن میں

اقیموا الصلوٰۃ اور اتوا الزکوٰۃ موجود ہے۔ اسی طرح یا ایہا الذین آمنوا، اصبروا وراشدوا شکر و امتثال بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کتب علیکم الصیام اور واللہ علی الناس حج البیت پاؤ گے تو دوسرے مقام میں یجتہو و یجہونہ اور والذین آمنوا شد حبائشہ بھی پاؤ گے جہاں قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی ہے اس کے ساتھ یراد ان الناس بھی ہے۔ اگر ایک مقام پر تلک نماز و زکوٰۃ کی خدمت ہے تو وہاں تکبر و عجب کی برائی بھی ہے۔ اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح ان میں ابواب نماز، روزہ، بیع و شراء، اور نکاح و طلاق پاؤ گے، اسی طرح ابواب ریاد کبر کو بھی دیکھو گے، اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکم الہی ہیں کیا اقیموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے تو اصبروا و اشکروا امر کا صیغہ نہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ظاہر احکام سب ہی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں،

آپ نے ملاحظہ فرمایا بس یہی وہ تصوف ہے جس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہا اور لکھا جاتا ہے کہیں اسے رہبانیت ثابت کیا جاتا ہے اور کہیں اس کا رشتہ سادھوؤں سے جوڑا جاتا ہے۔ کبھی اسے شریعت کا متوازی نظام بنایا جاتا اور کبھی ہندی اور یونانی فلسفے کا چر بہ کہا جاتا ہے کچھ لوگ اسے زندگی گریز ادارہ اور کچھ مذہب گو سفند قرار دیتے ہیں، بعض کے نزدیک مسائل حیات سے چشم پوشی کا دوسرا نام تصوف ہے اور بعض کے نزدیک یہ تصوف یا سیت و قنوطیت کا علمبردار ہے کوئی اسے باطنیوں کا نائندہ سمجھتا اور کوئی اشرافیوں اور مشائیوں کا ترجمان گردانتا ہے۔ حالانکہ سادہ

سی بات تھی۔ جسے اندیشہ عظیم نے فقط تریب و استان کے لیے بڑھا دیا ہے، اور
کے دو اقتباسات پڑھ کر تصوف نہ شریعت سے متوازی نظام قرار پاتا ہے اور نہ زندگی
گریز حمان کا حامل نظر آتا ہے نہ اس میں باطنیت کی بوہے اور نہ اشراقیت کی کچھ بھی
تو نہیں مگر انصاف کی نظر چاہیے۔

ممتاز موزح اور فلسفہ عمرانیات کے بانی علامہ ابن خلدونؒ اپنے شہرہ آفاق
”مقدمے میں تصوف کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے قسطنطنیہ میں
”تصوف کے مقاصد اصلیہ یہ ہیں کہ انسان عبادت الہی میں جان کھپائے
پوری طرح اللہ کا ہو جائے اور دنیا اور دنیا کی لغویات اور خرافات سے بالکل
مٹھ موڑ لے، عام دنیا دار جن چیزوں پر مٹے پڑے ہیں یعنی لذات و نیویہ اور
حب مال و جاہ سے قطعی کنارہ کش ہو جائے عبادت کے لیے عزت نشینی
اور گوشہ نشینی پسند کرے۔“

فرمائیے، عبادت الہی میں جان کھپانا اور پوری زندگی کو عبودیت و بندگی کے قالب
میں ڈھالنا شریعت کا مطالبہ نہیں اللہ کے لیے خفیہ، یعنی یکسو ہونا امر خداوندی نہیں؟
دنیا اور دنیا کی لغویات سے کنارہ کشی اسوۂ نبویؐ نہیں؟ حب جاہ و مال سے پاک رکھنا
اور لذات دنیوی میں محو و مستغرق نہ ہونا مسلمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں؟ عبادت
کے لیے انہماک اور یکسوئی شریعت کا حکم نہیں؟ اللہ سے لو لگانے اور فکر و اعتبار کیلئے
خلوت کا اہتمام کرنا سنت نہیں؟ یہ سب کچھ ٹھیک ہے تو تصوف نے کیا غلط کیا اور
کہا ہے کہ مورد الزام ٹھہر گیا ہے، اسے تو معمولی عقل والا آدمی بھی سمجھ لیتا ہے کہ نام
بدلنے سے کام کی حقیقت نہیں بدلتی، مگر تصوف کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟
یہی یہ بات کہ تصوف و سلوک کے بارے میں کچھ لوگوں نے اپنے قول و عمل
سے خلق گریزی، شعبہ بازی اور اس طرح کی خرافات کا جو تصور دیا ہے وہ صحیح ہے

یا غلط ہو تو ہمارے خیال میں بنی سوچے سمجھے کسی ادارے یا تحریک سے کوئی توقع وابستہ کر لینا جس طرح علمی سوچ نہیں کھلا سکتی اسی طرح غلط قیاسات کے باعث اصل تحریک کے اصولوں کو نظر انداز کر دینا بھی دیانت علمی کے منافی ہے، جنہوں نے تصوف کو امور غیب کے انکشاف کا ذریعہ سمجھا یا محض کشف و کرامات کا وسیلہ وہ بھی اور جنہوں نے غیر ثقہ نظریات اور عوام کے رجحانات کو بنیاد بنا کر تصوف کی ترویج و تہذیب کی، ہمارے نزدیک انہیں بھی ٹھوکر لگی ہے، تصوف و سلوک کا خلاصہ کیا ہے؟

مولانا اشرف علی تھانوی کہتے ہیں:-

- ۱۔ نہ اس میں کشف و کرامت ضروری ہے۔
 - ۲۔ نہ قیامت میں بخشوانے کی ذمہ داری ہے۔
 - ۳۔ نہ دنیا کی کار بر آری کا وعدہ ہے۔
 - ۴۔ نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی از خود اصلاح ہو جائے۔
 - ۵۔ نہ ایسے باطنی کیفیات پیدا ہونے کی کوئی معیار مقرر ہے کہ ہر وقت یا عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے، عبادت میں خطرات ہی نہ آئیں۔
 - ۶۔ نہ ذکر و شغل میں انوار و تجلیات کا نظر آنا یا کسی غیبی آواز کا سنانی دینا ضروری ہے۔
 - ۷۔ نہ عمدہ عمدہ خرابوں کا نظر آنا اور علامات کا صحیح ہونا لازمی ہے بلکہ اصل مقصود حق تعالیٰ کا راضی کرنا ہے جس کا ذریعہ شریعت کے حکموں پر پورے طور پر چلنا ہے۔
- ان تشریحی اقتباسات کے بعد ضروری ہے کہ قدیم تصوف کیا ہے؟
- صوفیاء اور ان کی عظیم تالیفات سے تصوف اور صوفی کے بارے میں بیان کیے گئے خیالات و افکار کو بغیر کسی لاحقے اور سابقے کے پیش کر دیا جائے تاکہ حقیقت نفس الامری واضح ہو جائے۔ تصوف ابتدا میں کیا تھا؟ تصوف کے پُران پر طحانے ولے کن افکار کے حامل تھے؟ ان کے نزدیک تصوف کی تعریف کیا تھی؟ وہ

کس چیز کو تصوف کی روح قرار دیتے تھے یہ اسی دوسری باتیں صوفیاء کی تحریکوں کے اقتباسات سے ہمارے سامنے آجائیں گی اور ہم تصوف کا صحیح تعارف حاصل کر سکیں گے۔ آسمان تصوف کے مہر شیخ ابو القاسم جنید بغدادیؒ جو سرخیل اولیاء ہونے کے ناطے سید الطائفہ کے عظیم الشان لقب سے ملقب ہیں، تصوف کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”تصوف مخلوق کی موافقت کرنے سے دل کو پاک رکھنا، بشری صفات (مذمومہ) سے علیحدگی اختیار کرنا، نفسانی خواہشات سے اجتناب کرنا، روحانی نفوس سے میل جول رکھنا، علوم حقیقی سے تعلق رکھنا، ہر لحظہ ایسے کام کمالنا جو اولیٰ اور افضل ہوں تمام امت محمدیہ کی خیر خواہی کرنا حقیقی طور پر اللہ سے وفا کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کی پیروی کرنا ہے۔“

شیخ جنید بغدادیؒ سے بھی پیشتر تصوف کے ممتاز رہنما اور مشہور صوفی شیخ عبد اللہ ترمذیؒ مسلک تصوف کی تشریح یوں کرتے ہیں:-

ہمارے مسلک کے اصول سات ہیں:-

- ۱۔ التمسک بکتاب اللہ تعالیٰ (کتاب اللہ سے مضبوط تعلق،
- ۲۔ اقتداء بر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (پیروی رسول صلی اللہ علیہ وسلم،
- ۳۔ اکل المال (رزق حلال)
- ۴۔ کف الاذی (ایذا رسانی سے پرہیز)
- ۵۔ اجتناب الاثام (گناہوں سے بیزاری اور نفرت،
- ۶۔ التوبہ (اللہ کی جانب رجوع،
- ۷۔ اداء الحقوق (خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی،

اسی بات کو بعض موقیاد نے دوسرے لغتوں میں بیان فرمایا ہے۔

- (۱) ادواء الغر الفتن (ذرائع فتن کی ادائیگی اور حقوق کی رعایت)
- (۲) اجتناب المحارم (خدا کی حدود کی پاسداری، منکرات سے پرہیز اور محرمات کی پابندی۔
- (۳) قطع العلائق (دنیا اور اہل دنیا سے دل ہٹا کر خدا کے لیے یکسو ہو جانا، تمام رشتوں کو چھوڑ کر خدا سے شدتہ جوڑ لینا)
- (۴) معالقتہ الفقر (آسائش کے بجائے آزمائش کی زندگی بسر کرنا، معائب و آلام کا خوش دلی سے استقبال۔
- (۵) ترک الطلب (دل کو آرزوؤں سے خالی کر لینا، امیدوں کو مختصر کرنا اور خدا کے علاوہ کسی سے حاجت برآری کی توقع نہ رکھنا)
- (۶) انقطاع الی اللہ (سب سے کٹ کر خدا کا ہو جانا، اللہ کے لیے کٹے اور جڑنے کا جذبہ پیدا کر لینا) تصوف کے چمن میں بکھرے رنگارنگ پھولوں سے دامن سجاتے اور ان کی خوشبو سے شام جاں کو مسطر کرتے اور رنگ و بو کی دنیا کی میرزا باتے ہوئے آگے چلے اور دیکھتے تصوف کیا ہے؟ اور صوفی کون ہے؟ کسی نے شیخ جنید بغدادیؒ سے پوچھا، تصوف کیا ہے؟ جواب میں فرمایا:۔
”حق تعالیٰ کے ساتھ پیوست ہو جانا، یہ کیفیت صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب نفس روح کی قوت اور حق کے ساتھ قائم رہنے کی وجہ سے اسباب سے بے تعلق ہو چکا ہو۔“
- شیخ ابوالحسن نورمئیؒ یوں گویا ہیں:۔
”تصوف کیا ہے؟ تمام خطوط نفس کا ترک کر دینا۔“
- حضرت شیخ ابن عطاءؒ کا ارشاد ہے:۔
”حق تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار رہنے کا نام تصوف ہے۔“

شیخ ابو علی قزوینی فرماتے ہیں :-

”التصوف هو الاخلاق التراضيه وتصوف لجمع اخلاق کو کہتے ہیں۔“
تصوف کی شہرہ آفاق کتاب رسالہ قشیریہ کے مؤلف امام ابو القاسم القشیری کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ دیاور ہے کہ یہ کتاب بقول مصنف، تصوف کے بارے میں پیدائشہ غلط فہمیوں کے ازالے کی خاطر لکھی گئی تھی، امام نے اپنی بزم مختلف چراغوں سے سجائی ہے، اور مختلف بزرگوں کے اقوال تصوف کے موضوع پر بڑی عمدگی سے ترتیب دے کر کتاب کو لوگوں کے سامنے گلہ استے کی صورت میں پیش کی ہے۔

شیخ ابو علی رودباری لب کشا ہیں۔

”تصوف باہد مذہب ہمہ تن سنجیدگی ہے، لہذا اس میں مہنسی اور مذاق کو نہ چلاؤ۔“

حضرت شیخ ابو محمد حسریری کا تبصرہ :-

”یہ ہر اعلیٰ اخلاق میں داخل اور ہر ذلیل خلق سے نکلنے کا نام ہے۔“
حضرت شیخ محمد بن علی قصاب کا بصیرت افروز تجربہ،
”تصوف وہ کریمانہ اخلاق ہیں جو کریم زمانہ میں کریم آدمی سے کریم لوگوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے ہیں۔“

حضرت شیخ سمون کی فلسفہ آمیز رائے،

”تصوف کیا ہے؟ تصوف یہ ہے کہ تو کسی چیز کا مالک نہ بنے اور نہ کوئی چیز تمہاری مالک بنے۔“

حضرت شیخ ابوبکر الکتانی محابے تکلف اظہار خیال،

”تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے، جس کے اخلاق تم سے بہتر ہوں گے۔“

وہ صوفی ہونے میں بھی تم سے بہتر ہو گا۔
 حضرت شیخ ابو علی رودباریؒ کا محبت بھرا جملہ۔
 ”محبوب کے در پر ڈیرے ڈال دینے کا نام تصوف ہے خواہ وہ دھکے
 ہی کیوں نہ دے۔“
 انہی کا فرمانا ہے۔

”معاذی اللہ! دل کی خوشی کا نام تصوف ہے۔“
 شیخ ابوالحسن مزینؒ کا فرمانا ہے۔
 ”حق تعالیٰ کی اطاعت کرنے کا نام تصوف ہے۔“
 الشیخ الاستاذ ابوسہل معلومیؒ ارشاد فرماتے ہیں۔
 ”تصوف اللہ کی رضا پر اعتراض نہ کرنے کا نام ہے۔“
 برصغیر پاک و ہند میں تشریف لانے والے قدیم صوفی بزرگ مایہ ناز و مسانی
 شخصیت اور عوامی محبت اور عقیدت کے بام بلند پرفاؤز سرشد کمال شیخ علی الجویری
 المعروف داتا گنج بخشؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب ”کشف المحجوب“ میں تصوف کے مفہوم
 پر مختلف بزرگان دین اور اہل صوفیا کے اقوال کا انتخاب پیش فرماتے ہیں۔
 حضرت داتاؒ نے شیخ ابوالحسنؒ کا ایک قول نقل کیا ہے۔

”..... لیس التصوف رسوما دلا علونا ولكنہ الاخلاق و تصوف کسی خاص
 وضع قطع یا علمی سادات کا نام نہیں بلکہ اخلاقِ حسنہ کا نام ہے۔“
 حضرت شیخ ابوالحسنؒ نورانیؒ تصوف کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔
 ”التصوف هو الحرۃ، والعتوۃ وترك الکلفۃ والسماء وبذل الدنیا وتصوف
 دل کی آزادی، جواں ہمتی، رسمی تکلفات سے دستبرداری، سخاوت اور
 زرو مال سے بیزاری کا نام ہے۔“

جناب داتا گزینہ تصوف کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

”دین کی اصل روح اور اس کی جان احکام الہی کی اخلاص و محبت کے ساتھ پیروی ہے۔۔۔۔۔ اور اسی کو ہم تصوف کہتے ہیں۔“

حضرت شیخ حسریؒ کا تصوف کے بارے میں کیا نقطہ نظر ہے، ملاحظہ ہو،

”تصوف نام ہے ضمیر کو مخالفت حق سے محفوظ رکھنے اور اس کی جلا و

نورانیت کو کدورت اور ہام سے بچانے کا۔“

دنیا کے تصوف کی جانی بچانی شخصیت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نزدیک بھی تصوف کا وہی مفہوم ہے جو دیگر ارباب تصوف کے ہاں ہے جسے ہم اقتباسات کی صورت میں پیش کر چکے ہیں، شیخ اپنی مختصر مگر جامع تالیف ”فتوح الغیب“ میں تصوف کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

”تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ سخاوت ابراہیمؑ، رضائے اسماعقؑ، صبر الیوبؑ، مناجات زکریاؑ، غربت یحییٰؑ، خرقہ پوشی موسیٰؑ، تجرد عیسیٰؑ اور فقر محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔“

یہاں تک تو ہم نے تصوف کے بارے میں صوفیاء کے نظریات و خیالات کا نچوڑ اور خلاصہ پیش کیا ہے جس سے کہیں بھی یہ مترشح نہیں ہوا کہ تصوف شریعت سے ہٹ کر کوئی نظام ہے، یا شریعت کے علاوہ کوئی بدعت ہے، بلکہ شریعت نے جو احکام و اوامر قانون کی زبان میں صادر کیے ہیں، تصوف انہیں دل نشین اور موثر پیرائے میں پیش کر کے جذبات محبت ابھارتا اور اطاعت و القیاد پر اکساتا ہے، ہم ایک بار پھر اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ اس چیز کی باضابطہ طور پر منظم صورت میں قیام کی ضرورت نہ پڑتی اگر احکام شرع الفاظ و حروف کے بازگروں کے ہاتھ کھلوانا نہ بن چکے ہوتے اور یوں روح شرع نہ کھلی جا رہی ہوتی۔

اب ہم اس عنوان میں صوفیاء کے نزدیک صوفی کون ہے؟ کی تشریح کرتے ہیں۔
 کیونکہ بعض نام نہاد اور لبادہ پوش لوگوں نے تصوف میں گھس کر خود کو اصلاح پذیر ہونے
 سے رہے الٹا تصوف اور طریق صوفیاء کو بدنام کر دیا، ایسی کالی بھڑوں کی نشاندہی ہر زمانے
 میں ہوتی رہی اور ان سے اظہارِ برائت کیا جاتا رہا، تصوف کی چند بنیادی اور اصولی کتابوں
 کی وجہ تالیف ہی یہی ہے کہ نام نہاد صوفیوں کو بے نقاب اور تصوف کے بارے میں
 ان کے ذریعے پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے، ان میں تعارف، رسالہ کشمیریہ،
 کشف المحجوب اور عوارف المعارف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امام ابو بکر محمد بن اسماعیل نے
 بھی دھند صاف کرنے کی اپنے تئیں کوشش کی، امام ابوالقاسم القشیریؒ نے بھی قلم کی
 نوک سے غلط فہمیوں کی تہہ کھرچنے کی سعی فرمائی، حضرت دامادؒ نے بھی صدائے احتجاج بلند
 کی اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے بھی تصوف کے دامن پر سے داغ دھبوں کو دور
 فرمایا، الغرض ہر ایک نے آئینہ تصوف کو گرد سے پاک صاف کیا اور اس کا چہرہ نکھارا۔
 حضرت شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ نام نہاد صوفیوں پر یوں برستے ہیں۔

”نام نہاد صوفی“ طبع“ کو“ ارادہ“ کہتے ہیں۔ رسو و ادب“ کا نام“۔ اخلاص“
 رکھا ہے۔ حق سے خدج کو شط“ کہتے ہیں اور مذموم چیزوں سے“ تلذذ“
 کو“ تلبیب“ (اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھانا) کہتے ہیں، خواہشاتِ نفس
 کی پیروی کو“ ابتلاء“ اور دنیا کی طرف رجوع کو“ وصول“ اور بد خلقی کو“ صولت“
 (بدبہ) اور بخل کو“ شکاوة“ (احتیاط) اور بد زبانی کو“ طامت“ کا نام دے رکھا
 ہے۔ حالانکہ یہ صوفیاء کا طریقہ نہیں۔“

اور اس کے مقابلے میں حضرت شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ کے نزدیک صوفیاء کے
 طریقے میں جو چیزیں شامل ہیں، ان کے بارے میں ان کی تحریر سے ایک اقتباس پیش
 خدمت ہے۔ مکتبہ میں۔

صوفیوں کے اخلاق میں علم، تواضع، نصیحت، شفقت، برداشت، موافقت، احسان، مدارات، ایثار، خدمت، الفت، بشارت، فتوت (مردانگی)، کرم، بذل جاہ، تملط، معروت، طلاقت، (کشادہ رُئی)، سکون، وقار، جملہ مسلمانوں اور بالخصوص جوان پر زیادتی کرے اس کے لیے دعائے خیر، ان کی تعریف کرنا، ان کے ساتھ حسن ظن رکھنا، اپنے آپ کو حقیر سمجھنا، بھائیوں کی توقیر کرنا، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں پر رحم، جو کچھ کسی کو دے اگرچہ بہت ہو اس کو کم سمجھنا اور جو کچھ کسی سے لے اگرچہ وہ کم ہو اس کو زیادہ جاننا یہ سب باتیں داخل ہیں۔

اب ہم بلا کم و کاست ”صوفی“ کے بارے میں صوفیاء کی آراء کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، عام طور پر لوگ صوفی اُسے کہتے ہیں جس کی علامات یہ ہوں، سر تراشیدہ ہو، خرقة پوش ہو، شکل و صورت سے مسکین ہو، ہاتھوں بالا التزام تسبیح رکھتا ہو، حق ہو کی ضربیں مارتا ہو، بیوی بچوں سے بے نیاز ہو، گھر بار سے پاک ہو، وغیرہم حالانکہ واقع میں ایسا نہیں، کیونکہ جس طرح کوئی شخص طیر می ٹوپی اور بگڑ کر بیٹھا ہو وہ سکندر نہیں ہو سکتا اسی طرح جو سر منڈا لے وہ قلندر نہیں بن جاتا جس طرح سکندری کے کچھ قتلے ہیں اسی طرح قلندری کے بھی کچھ مطالبے ہیں اور ادو وظائف ہی سے اگر تصوف کے قتلے پورے ہو جاتے تو آج دنیا کا بیشتر حصہ صوفی کہلاتے کا مستحق ہوتا، صوفی کو ان کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، جس کی تفصیل ہمیں تصوف کی مستند کتابوں میں ملتی ہے۔

سید الطائفہ شیخ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔

”صوفی کی مثال زمین کی سی ہے جسے نیک اور بدکار دونوں روندتے ہیں یا بادل کی سی ہے جو ہر چیز کو سیراب کرتا ہے۔“

شیخ حسین بن منصورؒ اس سے بھی کرا امیاری پیش کرتے ہیں۔
 ”صوفی کی ذات یکتا ہوتی ہے نہ کوئی اللہ کے سوا اسے قبول کرتا ہے
 اور نہ یہ اللہ کے سوا کسی کو قبول کرتا ہے۔“
 شیخ ابوالحسین نورؒ کے الفاظ میں صوفی کی تعریف،
 ”صوفی کی تعریف یہ ہے کہ اسے محتاجی کے وقت سکون ہو اور اگر کچھ پاس
 ہو تو ایشیا کر دے۔“

شیخ ابوبکر شبلیؒ کا تعارف کرانے کا انوکھا انداز۔
 ”صوفیاء کرام حق تعالیٰ کی گود میں بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔
 فکر انگیز لمبے میں شیخ ابوترابؒ بخشی صوفی کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔
 ”صوفی کے دل کو کوئی چیز سیلا نہیں کر سکتی، مگر اس سے ہر چیز کو صفائی
 حاصل ہوتی ہے۔“

اس موضوع پر شیخ ابوالحسن سیروانیؒ نے الفاظ سے جادوگری کا کام لیا ہے اور
 الفاظ کو اس خوبصورتی سے لکھا ہے کہ ہمارے شاید موتی بھی اس خوبصورتی سے نہ پرویا
 جاسکے، الفاظ کی بندشیں اور برستگی بھی دیکھئے اور حقیقت افزہ جملہ بھی پڑھیے۔
 ”صوفی ولادات کے ساتھ ہوتا ہے اور ادب کے ساتھ نہیں۔“

حضرت شیخ ابوبکر محمد بن اسحاقؒ نے اپنی کتاب ”العرف لمدبب اہل تصوف“
 میں صوفی کے بارے میں صوفیاء کرام کی آراء و رجحان کی ہیں، کچھ اقوال روح کی تازگی اور
 دل کی بالیدگی کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔

سب سے پہلے خود مولف کی رائے پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔
 ”جو نہ کسی چیز کا مالک ہو اور نہ کوئی اس کا مالک، بالفاظ دیگر یہ کہ دینیوی
 حرم و طمع نے اسے اپنا غلام نہ بنا رکھا ہو۔“

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

”صوفی وہ ہے جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور اگر مالک بنے تو اسے خرچ کر ڈالے۔“

حضرت ابو یعقوب سوسیؒ کی نظر میں صوفی کا کیا مقام ہے؟
 ”صوفی وہ ہے جو کسی چیز کے چمن جانے سے بے قرار نہ ہو اور نہ کسی چیز میں اپنے آپ کو ٹھکائے۔“

حضرت شیخ سہل بن عبداللہ ترمذیؒ سے دریافت کیا گیا۔ صوفی کون ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا:-

”جو ہر قسم کی میل کھیل سے پاک ہو، ہمہ تن غور و فکر ہو، مخلوق کو چھوڑ کر اللہ ہی کا ہو گیا ہو اور اس کے نزدیک سونے کی ڈلی اور مٹی کا ڈھیلا یکساں اہمیت رکھتا ہو۔“

حضرت داتا، ذوالنون مصریؒ کی رائے کو نقل کرتے ہیں:-
 ”الصوفی اذا نطق بانطقه، عن المعاني وان سكت، نطقت عنه الجوارح بقطع العلائق (اس کی گفتگو حقیقت کی ترجمان ہو اور اس کی خاموشی عوائق و علائق دنیا سے بیزاری کی غماز ہو)۔“

ہمارے دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ تصوف اعلیٰ اخلاق اور صوفی کریم النفس افراد کا نام ہے اور بلند اخلاقی اور کریم نفسی اسلام کا لب لباب اور عطر ہے، اسکی تفصیل آپ کو آئندہ صفحات میں ملے گی۔ فی الحال شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا قول ملاحظہ کیجئے،
 موصوف دوسری صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔

”صوفی وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل کے ذریعے سنت نبویؐ اور تہ دل سے اس پر عمل کرتے ہیں۔“

شریعت اور طریقت

تصوف اور صوفیاء پر منجملہ دیگر الزامات کے یہ الزام بھی بڑی شدت کے ساتھ عائد کیا جاتا ہے کہ اہل تصوف کے ہاں شریعت اور طریقت میں ثنویت پائی جاتی ہے۔ حلقہ تصوف میں زیادہ زور ظاہر کی نسبت باطن پر دیا جاتا ہے، گویا منتر ضیہ کے نزدیک ظاہر سے مراد شریعت اور باطن سے مراد طریقت ہے، حالانکہ بذات خود یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ متصوفین کے ہاں شرعی حدود و قیود کی مناسب پاسداری نہیں کی جاتی، بلکہ بعض حضرات تو یہ بھی کہہ ڈالتے ہیں کہ ان کے ہاں ایک وقت احکام شریعت موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس الزام میں حقیقت نا شناسی اور مخصوص سوچ کا عنصر کار فرما ہے، در نہ قدیم و حلیل صوفیاء کرام اور ان کی بلند پایہ تصانیف کے جائزے اور مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت و طریقت میں مخالف و تضاد اور افضل و معقول کی بحث تو کجا ان میں کسی درجے کی تقسیم و تفریق کا شائبہ تک نہیں ملتا، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے:

”جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرے وہ صوفی نہیں بلکہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔“

شیخ موصوف ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:-

”یہ خیال بڑا ہی ناپختہ ہے کہ ہم طریق تصوف کو شریعت اور قرآن و سنت کے مخالف سمجھنے لگیں۔ حاشا و کلا ان دونوں چیزوں میں کوئی مغایرت

یا اختلاف نہیں ہے۔“
آگے چل کر لکھتے ہیں:-

”یہ لوگ (صوفیاء کرام) کتاب و سنت کے عامل تھے اور شریعت و طریقت کی تمام ظاہری و باطنی حدود کا احترام کرتے تھے، انہوں نے کبھی ظاہری شریعت اور باطنی شریعت میں تغافل یا تساہل سے کام نہیں لیا۔“

یہ نظریہ محض شیخ محقق گماہی نہیں، بلکہ تصوف کی ہزاروں کتابوں کا محض اور نچوڑ ہی ہے بلکہ یہ تو ایوان تصوف کا سنگِ بنیاد ہے۔ لاکھوں صفحات پر پھیلے تصوف کے لٹریچر کو کنگال جائیے، سب کا لبِ لباب یہ الفاظ بنیں گے۔

”ہماری طریقت کی بنیادیں کتاب و سنت پر ہیں، جو ان کی مخالفت کرتا ہے ہمارے نزدیک وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور ہم اسے منکر احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں اگر ذکر الہی، نماز، تلاوت قرآن پاک میں ذوق، حضوری قلب اور خشوع خضوع حاصل ہو تو فتح الباب کی امید رکھنی چاہیے اگر یہ چیزیں حاصل نہیں تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو شخص قرآن و حدیث پر غور نہیں کرتا اور علماء و فقہاء کی صحبت سے دور رہتا ہے وہ بے ادب ہے اور تباہ و برباد ہو گا۔“ (ماخوذ از مرجع البحرین)

اگر انصاف، علمی دیانت اور ذہنی تحفظ کے بغیر تصوف کی اہمات کتب کا مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ارباب طریقت کے ہاں شرعی حدود کی پابندی کا احساس او جذبہ ملے گا بلکہ شریعت تمام تراحوال و اعمال کا منبع و مصدر نظر آئے گی اور یہ تاثر ربی پوری گہرائی کے ساتھ محسوس ہو گا کہ شرعی حدود و احکام کی پابندی کے بغیر کوئی شخص اپنے نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ کر ہی نہیں سکتا۔ حضرت ابو عثمان حیریؒ تو یہاں

محکم فرما چکے ہیں۔

تو میرے بیٹے بظاہر میں سنت کے خلاف کرتا باطن میں ریاکاری کی علامت ہے۔

صوفیاء کرام کے ہاں کمالات ولایت اور مدارج طریقت میں پھیلیوں کی طرح سمندر میں تیرنا اور پرندوں کی مانند فضاؤں میں اڑنا شامل نہیں بلکہ خالصتاً قرآن و سنت کی تابعداری اور پیروی اصل و اساس ولایت ہے، اس ضمن میں شیخ بایزید بسطامی کا قول دلیل قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

”اگر تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اسے کرامات دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑتا ہو پھر بھی تم اس سے دھوکا نہ کھانا یہاں تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ وہ اوامر و نواہی کی پابندی، حدود الشریعہ کی محافظت اور شریعت کو پاسداری میں کیسا ہے۔“

جس طریقت کی بنیاد شریعت پر نہیں ایسی طریقت کے بارے میں صوفیاء کرام کی کیا رائے ہے؟ ملاحظہ ہو شیخ ابوسعید خراز کا ایک قول، جسے امام ابوالقاسم قشیریؒ نے اپنے ہاں بڑے اہتمام سے نقل کیا ہے:-

”ہر وہ باطن (طریقت) جو ظاہر (شریعت) کے خلاف ہو باطل ہے۔“

اگرچہ یہ قول اس موضوع پر حرفِ آخر ہے مگر صوفیاء تو پاسداری شریعت کا اس درجہ خیال رکھتے ہیں کہ جو شخص شریعت کی حدود کو نظر انداز کر کے طریقت کا مدعی ہے یا طریقت کی آڑ میں اپنے آپ کو احکام شرعیہ میں مرفوع قرار دیتا ہے اسے صوفی دراہد سمجھتا تو درکنار جہنم کا ایندھن تصور کرتے ہیں، تاہم کے لیے شیخ ابوالقاسم دمشقیؒ کی ایک روایت نقل کی جاتی ہے جو انہوں نے شیخ ابوعلی رودباریؒ سے کی ہے:-

”کسی نے شیخ ابوعلی احمد سے ایک شخص کے متعلق پوچھا جو مزار میر مستن

ہے اور پھر کہتا ہے کہ یہ تو میرے لیے جائز ہے کیونکہ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ اب مجھ پر حالات کے اختلاف کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس پر شیخؒ نے فرمایا ہاں پہنچ تو چکا ہے مگر جہنم میں نہ۔

صوفیاء کرام کے ہاں اگر شریعت و طریقت کے نام کی دو اصطلاحیں ملتی ہیں تو صرف اس انداز میں کہ اعضاء و جوارح سے احکام کی بجا آوری شریعت اور اس میں اخلاص روح کا پیدا کرنا طریقت ہے۔ ظاہر ہے احکام پر عمل درآمد ہوگا، تو اخلاص بھی ہوگا۔ اس سے عمل ہی نہ ہو تو کا ہے کا اخلاص اور کیسی روح؟ یہاں پھر بھی شریعت مقدم رہی اس مسئلہ کو شیخؒ نجفی منیریؒ نے اپنے ایک مکتوب میں بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے، لکھتے ہیں:-

”طریقت کی راہ بھی اسی شریعت سے نکلی ہے، شریعت و طریقت میں جو فرق ہے اس کو ہم بیان کرتے ہیں تم اسی سے سمجھتے جاؤ، شریعت میں توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور دوسرے احکام و شرائع اور معاملات ضروری کا بیان ہے، طریقت کہتی ہے کہ ان معاملات کی حقیقت دریافت کرو، ان مشروعات کی تہ تک پہنچو، اعمال کو قلبی معنائی سے آراستہ کرو، اخلاق کو نفسانی کدورتوں سے پاک کرو، جیسے ریاکاری ہے، ہوائے نفسانی ہے، ظلم و جفا ہے، کفر و شرک ہے اچھا اس طرح نہ سمجھو تو یوں سمجھو، ظاہری طہارت اور ظاہری تہذیب سے جس امر کو تعلق ہے وہ شریعت ہے، تزکیہ باطن اور تصفیہ قلب سے جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے، کپڑے دھو کر ایسا پاک بنا لینا کہ اس کو پہن کر نماز پڑھ سکیں، یہ فعل شریعت ہے اور دل کو پاک رکھنا کدورت بشری سے یہ فعل طریقت ہے، ہر نماز کے لیے وضو کرنے کو فعل شریعت

سمجھو اور ہمیشہ یاد ضرور رہے کہ طریقت کا دستور العمل تصور کرو، نماز میں قبلہ
روکھڑے ہونا شریعت ہے اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہونا طریقت
ہے۔ جو اس ظاہری سے جن معاملات کا دینی تعلق ہے اس کی رعایت
محوط رکھنا شریعت ہے اور جن معاملات دینی کو قلب و روح سے تعلق ہے
اس کی رعایت کرنا طریقت ہے۔

مکتوب کے اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا اب قارئین کا
کام ہے کہ اس میں کہاں شریعت کو نظر انداز کیا یا غیر ضروری قرار دیا گیا ہے، جو کچھ طریقت
کے ذیل میں کہا گیا ہے اسے جو بھی نام دیا جائے بہر حال یہ تقلدِ شریعت کے بھی ہیں
اگر یہ تقسیم برقرار رکھی بھی جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ جسم و روح والی بات ہے
جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اسی طرح شریعت و طریقت کو ایک دوسرے
کے لیے ناگزیر کہا جائے تو کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی یہی بات شیخ عبداللہ انصاریؒ
نے اپنے انداز میں کہی ہے۔

”ہر چند کہ شریعت سرِ بر حقیقت ہے اور حقیقت تمام شریعت، حقیقت
کی بنیاد شریعت ہے، شریعت حقیقت کے بغیر اور حقیقت شریعت کے
بغیر بے کار ہے اور عمل کرنے والے ان دو کے بغیر بے کار ہیں۔“
شریعت کو نظر انداز کر کے مراحل طریقت طے کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے بہر طریقت
کے میدان میں قدم رکھنے کا بہترین وسیلہ کیا ہے؟ اسے مؤثر اور دلنشین پیرائے میں
شیخ محی الشرف الدین مینریؒ واضح فرماتے ہیں، ان کے طویل مکتوب کا ایک اقتباس
پیش خدمت ہے:-

”براہِ عزیز! شریعت کے بغیر طریقت کا قصد کرنا ویسا ہی ہے کہ ایک
شخص کو ٹھے پر جانا چاہیے تو سیرھی کو توڑ ڈالے اور دیوار پکڑ کر اوپر چڑھے

نتیجہ یہ ہوگا کہ دو چار ہاتھ بہ مشکل اوپر جائے گا پھر پھسل پھسل کر گرے گا۔ یا
یوں سمجھو کہ ایک شخص کو یہ خط سامنے کہ ہم پتھر الیا اچال سکتے ہیں کہ نظر
سے غائب ہو جائے ہزار ہزار روٹ گائے گا، کوشش کا خاتمہ کر دے گا
نا کامیاب رہے گا بہ مشکل اچالے گا، دم سے آتا رہے گا بغیر شریعت
جسم خالی پتھر سے بدتر ہے وہ شخص فضائے طریقت میں اڑ نہیں سکتا یہ
کوشش لاماصل ہوگی۔ ۛ

انہی شیخ موصوف کے یہ الفاظ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔
”ولی صادق وہی کہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جو نبی چاہتا ہے۔“ ۛ

اس بحث کے ضمن میں یہ بات بھی بالعموم سنی اور پڑھی جاتی ہے کہ صوفیاء کرام کا
اکثر و بیشتر انحصار ذوق، کیفیت کشف اور اس طرح کے دیگر احوال پر ہوتا ہے۔ مگر حقیقت
یوں نہیں، کیونکہ جس طرح زندگی کے دوسرے امور و مسائل کی عنان ذوق و کیفیت کے
ہاتھ میں نہیں دی جاسکتی تو مسائل تصوف میں یہ کیسے بار پائے؟ یہ الگ بات ہے، اگر
اس جذبے اور ذوق کی قرآن و سنت سے تائید ہوتی ہو پھر اسے ضرور سند کا درجہ ملنا
چاہیے اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو مشہور صوفی بلکہ امام الاصفیاء شیخ اسماعیل بن
عبدالقدوس سمریؒ کا فیصلہ صدیوں پیشتر تاریخ میں محفوظ ہے۔

”ہر وہ جذبہ اور وجدانی کیفیت جس کی شہادت کتاب و سنت سے نہ
ملے باطل ہے۔“ ۛ

یہی بات بغیر الفاظ شیخ جنید بغدادیؒ کے ہاں نظر آتی ہے۔

”ہمارا مذہب (تصوف) کتاب و سنت کے اصولوں کا پابند ہے۔“ ۛ

صوفیاء کرام شرع شریف کے معاملہ میں علماء طواہر سے کسی صورت کم حساس نہیں
صوفیاء کرام کے ہاں شریعت سے ہٹ کر کوئی عمل کرنا، شریعت کے حوالے کے بغیر کوئی

بات سنا، کسی ایسی مجلس کا اہتمام یا اس مجلس میں شرکت جہاں شریعت کو ملحوظ رکھے
 بغیر گفتگو ہوتی ہو محدود و رعبہ خطرناک اور ملک ہے جو شخص قرآن و سنت سے الگ
 کسی بات کا دعویٰ کرتا ہے۔ اُس کا صوفی یا صاحبِ طریقت ہونا تو محال ہے ہی اس
 کی صحبت اختیار کرنا ایک خطرہ عظیم سے کم نہیں۔ جزم و احتیاط کی راہ میں ہمارے لیے
 شیخ ابوالحسن احمد فوریؒ کا فرمان مشعل کا کام دیتا ہے۔ فرماتے ہیں :-
 ”جس شخص کو تو اللہ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتے ہوئے دیکھے جو
 اسے شریعت کی حد سے نکال دے تو تجھے اس شخص کے قریب بھی نہیں
 پھٹکنا چاہیے۔“ ۱۳

شیخ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں :-

”چونکہ ہمارا (تصوف) و معرفت کتاب و سنت کا پابند ہے اس لیے
 جس شخص نے نہ قرآن حفظ کیا ہو اور نہ حدیث لکھی ہو، راہِ طریقت میں اس
 کی پیروی نہ کی جائے گی۔“ ۱۴

اگر کوئی شخص صوفیہ کرام کی ان تصریحات کے بعد بھی کسی قرآن و سنت کی راہ سے
 بٹ کر چلنے والے کو صوفی یا دلی کہتا ہے تو یہ سراسر انصافی ہے کیونکہ صوفیاء تو پیچھے
 کرتارک کتاب و سنت کے بارے میں کہہ رہے ہیں :-

”جو شخص ہر وقت اپنے افعال کو کتاب و سنت کی میزان میں نہ تولتا ہو ہم
 اسے ”دیوانِ رجال“ میں شمار نہیں کرتے۔“ ۱۵

ضمناً اس اعتراض کا جائزہ بھی لے لیتا چاہیے کہ صوفیوں کے ہاں علم کی بڑی کمی
 ہوتی ہے اور منازلِ سلوک طے کرنے کے لیے علم کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا یہ اعتراض
 بھی محض برائے اعتراض ہے۔ واقعہ میں بالکل ایسا نہیں۔ اگر صوفیہ کرام کی تعلیمات کو
 بغور اور تفصیل پڑھا جائے تو ان کی علمی گہرائی، نکتہ بینی، ہدایت و فطانت اور مطالعاتی

ذوق کا معترف ہونا پڑتا ہے، صوفیاء کرام کے نزدیک وہ شخص صاحبِ رشد و ہدایت نہیں ہو سکتا جو علوم شرعیہ کا معتبر عالم نہ ہو۔ بابا فرید الدین گنج شکر فرمایا کرتے تھے:

”جاہل پیر، سحرہ شیطان ہوتا ہے۔“

شیخ جنید بغدادی اپنے بارے میں لکھتے ہیں:-

”میں نے پہلے علم حدیث اور فقہ حاصل کیا۔ اس کے بعد شیخ عارف المصطفیٰ صاحب کتاب الرعایا کی صحبت اٹھائی اور یہی میری کامیابی کا راز ہے کیونکہ علم تصوف کو قرآن کے تابع رہنا چاہیے جس نے تصوف سے پہلے قرآن مجید حفظ نہ کیا ہو ریانہ پڑھا ہو اور حدیث میں سند حاصل نہ کی ہو، اسے

دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں۔“

شیخ سری سقطیؒ نے جو شیخ جنید بغدادیؒ کے ماموں بھی ہیں اور مرشد فیض بھی،

جنید بغدادیؒ کو دعا دی:-

”خدا تمہیں ایسا محدث بنائے جو علم تصوف سے بھی آگاہ ہو یا پھر ایسا صوفی

جو علم حدیث سے بھی آشنا ہو۔“

اس دعا میں صراحتہ محدث بننے کو مقصود ہونے پر ترجیح حاصل ہے خواجہ نظام الدین

اولیاء شیخ طریقت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

پیر ایسا ہونا چاہیے کہ احکام شریعت، طریقت، اور حقیقت کا علم رکھتا ہو اگر

ایسا ہو گا تو خود کسی نامشروع چیز کے لیے نہ کہے گا۔“

اس ضمنی بحث کو ہمیں ختم کر کے ہم دوبارہ اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں، کسی

شخص کا ذوق اور وجدان جس طرح شریعت میں ناقابل قبول ہے، اسی طرح طریقت میں

بھی اس امر کا خاطر خواہ لحاظ کیا جاتا ہے۔ طریقت کے ہر نکتے کی شریعت مطہرہ سے تائید

مزدوری سمجھی جاتی ہے اور جملہ ارباب طریقت نے طریقت پر شریعت کو نگہبان بنایا ہوا

ہے، اور صرف آغاز شریعت ہی کو قرار دیا جاتا ہے، شیخ ابوسلیمان عبد الرحمن دارانیؒ فرماتے ہیں :-

”بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے دل پر صوفیاء کے نکات معرفت وارد ہوتے ہیں اور کئی دنوں تک رہتے ہیں مگر جب تک کتاب و سنت، دونوں عادل گواہ انہیں قبول نہ کریں میں انہیں قبول نہیں کرتا“ لکھ

اب ہم اس بحث کو سیٹھتے ہوئے آخسر میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔ سونہ اس موضوع پر بزرگان دین اور صوفیاء کرام کے اقوال کا ایک انبار لگایا جاسکتا ہے، لیکن ذہن صاف اور آنکھ زلگین شیشہ سے پاک ہونا ایک ہی حوالہ اتمام حجت کے لیے کافی ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ رقم طراز ہیں :-

”کچھ فتنہ کے مارے ہوؤں نے صوفیوں کا لباس پہن لیا ہے کہ صوفی کلام میں حالانکہ ان کو صوفیاء سے کچھ علاقہ نہیں۔ بلکہ وہ مغرور غلط ہیں مبتلا ہیں، جکتے ہیں کہ اُن کے دل خالص خدا کی طرف مبتلا ہو گئے اور یہی مراد کو پہنچ جانا ہے اور رسوم شریعت کی پابندی عوام کا مرتبہ ہے۔ ان کا یہ قول خالص الحاد اور زندقہ ہے اس لیے کہ جس حقیقت کو شریعت ذکر سے وہ حقیقت نہیں بے دینی ہے۔“ لکھ

اس قدر مدلل بحث، واضح اقوال اور مستند آراء پیش کرنے کے بعد سرسبز چراغ اور بے حمانہ چراغ ہو گا اگرچہ بھی یہ الزام تصوف اور اہل تصوف کے سر تقویٰ جائے کہ ان کے ہاں شریعت اور طریقت میں امتیاز و تفریق ہے اور شریعت کے قواعد و ضوابط کو مد نظر نہیں رکھا جاتا حقیقت یہ ہے کہ تصوف جہاں مذہب کی روح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے وہاں اس کی اساس شریعت مطہرہ اور اس کا سرچشمہ، قرآن و حدیث ہے۔

کشف و کرامت

بالعموم تصوف اور صوفیاء کا ذکر آتے ہی ذہن شب و روز کے اور ادو وظائف ،
 چلوں ، مراقبوں ، تسبیح گردانی اور حق ہو کی ضرب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ، صوفیاء انہیں
 سمجھا جاتا ہے جن کے ہاتھوں دن رات عجائب و غرائب اور محیر العقول واقعات
 کا ظہور ہوتا رہتا ہے ، انکشافات کا دور دورہ ہوتا ہے ، غیب کی خبریں آئندہ کے
 حالات اور ہوشربا کمالات انسان کو درجہ ہیرت میں ڈالے رکھتے ہیں ، یہ لوگ کبھی ہمد
 میں مصطفیٰ سے کشتی کا کام لیتے ہیں ، کبھی بیٹھے بیٹھے دنیا کی سیر کرتے ہیں کبھی ذرا جہنم
 کی اور فضاؤں میں اڑنا شروع کر دیتے ہیں یہ اور اس قسم کے طلسماتی قہقہے مشہور و
 معروف ہیں ۔ اس قسم کی رائے قائم ہو جانے کی دو وجوہ ہیں ۔ اولاً تصوف اور ارباب
 تصوف کے خلاف پروپیگنڈہ والستہ اور نادانستہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ تصوف
 و اہل تصوف کو کشف و کرامت کے حوالے کے بغیر پہچانا بھی نہیں جاسکتا ، ثانیاً جب
 سے تصوف بحیثیت ادارہ کے اپنی غایت حقیقی اور غرض اصلی سے ہٹا ہے اور مسند
 تصوف کے وارث اپنا مقصود بھلا بیٹھے تو اقبالؒ کے الفاظ میں اس کے علاوہ
 کیا رہ جاتا تھا ؟

ۛ رہا نہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی فسانہ ہائے کلمات رہ گئے باقی
 در نہ ذرا سنجیدہ نظری اور اخلاص نیت کے ساتھ تصوف کی اہمات کتب اور

صوفیاد کرام کی سیر و سوانح کو پڑھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ تصوف محض کشف و کرامت یا اوراد و وظائف کا ادا نہ نہیں بلکہ ایک عالمگیر تحریک ہے۔ ایسا سانچہ جس میں انسان ڈھالے جاسکتے ہیں، ایسی بھی جہاں سے انسان کندن بن کر نکلتے ہیں، تصوف ایک ایسا ادارہ ہے جہاں تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کا انتظام ہے جہاں "تخلقوا باخلاق اللہ" کی عملی تفسیر پڑھائی جاتی ہے، جو ملکیت اور عمریت کے خلاف مضبوط مورچہ ہے، جہاں دکھی اور چین، سکون کو ترستی دنیا کے لیے سکون کا سامان ملتا ہے، جہاں ہر شخص اپنی انسانیت اور غیرت نفس کا پچشم خود مشاہدہ کرتا ہے جہاں ذات پات اور دنیوی تفریق کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ جہاں ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھا ایک پیمانے سے پرکھا ایک کسوٹی سے جانچا، ایک معیار پر رکھا اور ایک میزان میں تول جاتا ہے، جہاں سوائے ذکر الہی اور خدا خونی کے کسی مناظرہ اور مباحثہ کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ جہاں قلب و نظر میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے، جہاں علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ یقین پیدا کیا جاتا ہے۔ جہاں نفرت کے بجائے محبت کے زمرے بستے ہیں جہاں الجھنے کے بجائے سلجھنا سکھایا جاتا ہے جہاں دماغ کو رمز آگاہ اور دل کو سوز آشنا بنایا جاتا ہے، جہاں راکو کے ڈھیر میں دبی چنگاری کو شعلہ بدایا جاتا ہے، جہاں رنگت مخلوق کو ہوا بدوش بنایا جاتا ہے، رہا کشف و کرامت کا مسئلہ تو اسے نہ پہلے اہمیت حاصل تھی نہ اب ہے، ظاہر ہے جب نا اہل منصب قضا و سبجال لیں اور قلم غدار کے ہاتھ میں ہو تو۔

عکس منظر بردار سے بود

ایسا ہی المیہ تصوف کے ساتھ ہوا ہے، غیر تاک میں تھے، اپنوں نے موقع مہیا کر دیا اور روئے پر روئے چڑھتے گئے، ورنہ کہاں تصوف اور کہاں کشف و کرامات کے چرچے؛ اولیاد کرام کے ہاتھوں کرامات ظاہر ضرور ہوئیں، اجیر کے سنیا سی اور

جوگی کا مقابلہ اس کے بغیر ممکن نہ تھا بعد میں بننے والے شیخ ہندیؒ سے اسی طرح مطالبہ
 سکتا تھا، فرعونؑی دربار میں رسیوں کا سحر عسائے موسیٰؑ ہی سے زائل کیا جاسکتا ہے۔
 جالینوس کے پیروؤں کا طبی طلسم ”قوبا ذن اللہ“ کہہ کر کوئی ”مسح“ ہی توڑ سکتا ہے۔
 لیکن اسی بات کو تصوف کی بنیاد سمجھ لینا صریح نا انصافی ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں :-

”سلوک کے سو درجے مقرر کیے گئے ہیں ان میں ستر حواں درجہ کرامت ہے۔
 اگر سالک اسی درجے میں رہ جائے تو وہ باقی کے ترسی درجوں تک کیسے پہنچے گا؟
 صوفیاء کرام کی تبلیغی کوششوں کا ہم الشاء اللہ اگلے صفحات میں بھرپور جائزہ لیں
 گے تو ثابت ہو جائے گا کہ صوفیاء نے کشف و کرامت کے ذریعے دنیا میں کام نہیں کیا
 بلکہ ایک مجاہد کی سی شان کے ساتھ جھوپڑوں سے ایوانوں اور گلہ بانوں سے لے کر
 جہاں بانوں تک پہنچے اور تبلیغ و وعظ کا حق ادا کیا کیونکہ تصوف برپا شریعت ہی تو ہے، جو احکام
 شریعت کے وہی تصوف کے اور جو ذمہ داریاں اہل شرع کی وہی ذمہ داریاں اہل تصوف
 کی ہیں، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں :-

”خواجہ عبید اللہ احرار فرمایا کرتے تھے اگر میں صرف پیری مریدی کروں تو
 کسی بھی پیر اور شیخ کو جہاں میں مرید میر نہ آسکے سب کو میں اپنی ہی طرف
 کھینچ لوں، مگر میرے ذمہ دوسرا کام لگایا گیا ہے وہ ہے شریعت کی ترویج
 اسلام کی تائید، اس بنا پر آپ کے پاس تشریف لے جاتے اور
 اپنے تصرف سے ان کو اپنا مطیع بناتے اور اس ذریعہ سے شریعت حقہ
 کی ترویج فرماتے“

سچی بات یہ کہ تصوف میں کشف و کرامات کا اعتبار نہیں بلکہ ایمان کی پختگی اور
 اعمال و احوال کی درستگی کا چلن ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں :-

”والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ نکتہ حضرت حافظ (سید عبد اللہ) سے
کئی بار سنا کہ کفش برکشت“ رکشت کے سر پر جوتا یعنی صوفیاء کے نزدیک
استقامت معتبر ہے نہ کہ کرامت“۔ ۵۴

شریعت و طریقت کے عنوان میں ہم حضرت بایزید بسطامیؒ کا یہ قول پہلے بھی نقل
کر آئے ہیں مگر موضوع کی مناسبت اور قول کی اہمیت کے پیش نظر مذکورہ کے طور پر
اسے دوبارہ پڑھ لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

”اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامات عطا کی گئی ہیں حتیٰ کہ وہ ہوا میں اڑتا
ہے تو اس سے دھوکا مت کھاؤ۔ جب تک کہ یہ نزدیک لو کہ وہ اوامر و
نواہی کی رعایت، حدود اللہ کی محافظت اور آداب شریعت کی پیروی
میں کیسا ہے؟“ ۵۵

اگر ابتدائی دور میں تعوت پر جبکہ وہ عالم شباب میں تھا نگاہ ڈالیں تو جوں جوں
آپ اوپر جائیں گے کرامات اتنی ہی کم نظر آئیں گی، بلکہ زیادہ سے زیادہ ذرا اصلاح اعمال
و اخلاق ہی نظر آئے گا، کیونکہ علم و عمل کی قوت سے ہی سرکش ذہن اور باغی دل مسخر
کیے جاسکتے ہیں جو کشش اور تاثیر اخلاق میں ہے وہ کشف و کرامت میں کہاں؟ اس
نے قدیم صوفیاء کرام کے حالات زندگی پر لکھی گئی کتابوں کا ایک ایک ورق الٹ پلٹ
کر دیکھ لیجئے، کرامات ڈھونڈنے سے مشکل ہی ملیں گی۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:-

”ظہور خوارق پر نظر رکھنا کوتاہ نظری ہے اور استعداد تعلیمی کم ہونے
کی دلیل ہے، میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اکثر متقدمین سے بھی ساری عمریں پانچ
چھ خوارق سے زیادہ کا ظہور نہیں ہوا۔ حضرت جنیدؒ جو اس گروہ کے سردار
میں، معلوم نہیں ان سے دس کرامات کا ظہور بھی منقول ہو؟“ ۵۶

بعض مستند صوفیاء کے نزدیک تو کرامت کو حیض الرجال سے تعبیر کیا گیا ہے،

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا مشہور قول ہے۔

”عظم ایمان باید خورد، در پے کرامت نباید بود۔“

یہ تاثر حجب سے قائم ہوا ہے اُس دن سے کسی ولی کی ولایت کا معیار صرف اور صرف کرامت ہی رہ گیا ہے، جس سے جتنی زیادہ کرامتیں منسوب ہوں گی۔ وہ اتنا ہی زیادہ باخدا بزرگ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ”اعلمکم و اتقاکم“ کی جو قید شریعت میں ہے وہی تصوف میں بھی ہے۔ جسے دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس بات کو ایک حکایت کے ذریعے شیخ سیف الدین حمویؒ نے بڑی خوبصورتی اور عمدگی سے واضح فرمایا ہے، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ان سے روایت کرتے ہیں۔

شیخ سعد الدین حمویؒ ایک مرد بزرگ تھے اگر شہر کا والی ان سے عقیدت نہیں رکھتا تھا ایک دن ایسا ہوا کہ والی شہر شیخ کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچا..... آپ نے خوشی کا اظہار کیا چنانچہ دونوں اکٹھے بیٹھ گئے پاس ہی ایک باغیچہ تھا شیخؒ نے وہاں سے کچھ سیب لانے کا اشارہ کیا چنانچہ جب سیب لائے گئے شیخؒ نے اسے کھایا، سامنے پڑی ہوئی طشتی میں ایک موٹا سیب دھرا تھا۔ والی کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر شیخ کرامت اور صفائی باطن کے مالک ہیں تو یہ موٹا سیب مجھے دیدیں۔ جیسے ہی والی کے دل میں یہ خیال آیا شیخؒ نے ہاتھ بڑھایا اس سیب کو اٹھایا اور والی کی طرف منہ کر کے کہا ایک دن میں سفر میں تھا، دوران سفر ایک شہر میں پہنچا۔ شہر کے دروازے پر بھڑنگی تھی ایک بازیگر کرتب دکھا رہا تھا۔ اس بازیگر کے پاس ایک گدھا تھا۔ اُس نے کپڑے سے گدھے کی آنکھیں باندھ رکھی تھیں، اس اثنا میں اس نے ہاتھ میں ایک انگشتری لی اور وہ انگشتری تماشائیوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں ڈال دی۔ اس وقت بازیگر لوگوں کی طرف

متوجہ ہوا اور کہا جس کے ہاتھ میں انگٹری ہے گدھا اُسے ڈھونڈ لکالے گا اس پر وہ گدھا اس مجمع کے اندر چکر لگانے لگا اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ ہر ایک کو سونگھتا سونگھتا اس آدمی کے پاس پہنچ گیا، گدھا وہاں کھڑا رہا۔ بازی گر آیا اور اس نے اس آدمی سے انگٹری لے لی، اس حکایت کو بیان کرنے کے بعد شیخ حمویہ نے والی شہر سے کہا اگر کوئی شخص اپنے کشف اور کرامت کا ذکر کرتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو اسس بازی گر کے گدھے کے درجے پر رکھتا ہے، اگر وہ اس بارے میں کچھ نہیں کہتا تو تمہارے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ اس شخص میں صفائی باطن نہیں، شیخ نے یہ فرمایا اور سیب والی شہر کے سامنے رکھ دیا:۔

اس واقعہ میں تین باتیں واضح ہوئیں :-

اولاً :- وہ ذہنیت جو کرامت کو اساس ولایت جانتی اور مانتی ہے۔

ثانیاً :- کرامت صوفیاء کے نزدیک کس درجے کی چیز ہے؟

ثالثاً :- کرامت ظاہر ہو بھی تو اس سے مقصود کیا ہوتا ہے؟

اس ساری بحث سے پتہ چلا کہ صوفیاء کی محافل و مجالس خوارق سے معمور نہیں ہوتیں بلکہ اُن کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ غم روزگار میں الجھا ہوا افسردگیوں اور مایوسیوں میں لپٹا ہوا محرومیوں سے سمٹا ہوا، حادثاتِ زمانہ میں گھرا ہوا کوئی شخص جب اُنکی محفل میں جاتا تو ایک بار اُسے یوں لگتا جیسے اُس کے ذہن سے غم کا ایک ایک کانٹا نکال لیا گیا ہے، اب کوئی کھٹک اُس کے دل میں اور کوئی پچانس اس کے حلق میں نہیں رہی اس لیے کہ اطمینانِ قلب کا اصل ذریعہ ذکر اللہ ہے اور یہی جنس ”وکان تصوف پر“ لہذاں“ ہے۔

شعبدوں اور عجبوں کی دنیا کا تزکیہ و تصفیہ کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں :-

”امیر ابو العلاء فرمایا کرتے تھے، اگر کوئی شخص ہماری مجلس میں اس صحرا
نور کی طرح سکون محسوس کرتا ہے جو انتہائی گرمی کے موسم میں کسی
درخت کے سائے میں پہنچ کر اپنے تن بدن کی راحت محسوس کرتا ہے
تو اسے ہماری صحبت مبارک ورنہ وہ دوسری جگہ چلا جائے کیوں کہ ہمارے
ہاں کشف و کرامت کی دنیا نہیں بلکہ عالم الوندی ہے۔“

تصوف — اہمات کتب

تصوف — اور ماب تصوف کے بارہ میں پیدا شدہ غلطیوں کے اسباب میں ایک اہم سبب مطالعہ کرنے والوں کی سہل انگاری کو قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ غیروں نے جان بوجھ کر اپنے مطلب کے لیے وہ تحریریں اخذ کر لیں جو ان کے لیے مفید اور تصوف کے خلاف بطور ہتھیار استعمال ہو سکتی تھیں۔ اگر یہ انداز تحقیق کے معیار پر پورا اترتا ہے تو اسے اپنا کر کسی بھی کتاب کے بارے میں غلط رائے قائم کی جاسکتی اور غلط تاثر دیا جاسکتا ہے، اور اس سے الہامی کتابیں بھی شائد محفوظ رہ سکیں، جیسا کہ سستیارتہ پر کاش میں قرآن مجید پر تبصرہ کیا گیا ہے، پس منظر کو نظر انداز کر کے کسی واقعہ کا بیان، مجموعی مزاج سے صرف نظر کر کے ایک رخا مطالعہ، خذ، اصفا کے اصول کو پس پشت ڈال کر کمزور باتوں کا تعاقب اگر ایسے ہی منفی نتائج پیدا نہ کرے گا تو اور کیا ہوگا؟ کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے اس کے متعلق ایک مخصوص نظریہ قائم کر لینے، خاص زاویہ نظر اپنا لینے، اور دل میں سو وِطن پیدا کر لینے کا نتیجہ اس سے شائد ہی مختلف نکلا ہو، ہر بات پر گرفت کرنا، ہر کمزوری پر نظر رکھنا، اور ہر لفظ سے غلط مطلب نکالنا، جب اپنے لیے فرض قرار دے لیا جائے تو زیر بحث موضوع کا حلیہ بگڑے گا یا نہیں؟ اپنے بھی اس کو تا ہی میں برابر کے شریک اور حصہ دار ہیں، انہوں نے اس عالمگیر اخلاقی، اصلاحی اور روحانی تحریک کا مطالعہ

کرتے ہوئے دماغ سوزی اور پتہ ماری سے کام لینے کی بجائے ہر سری نظر ڈالنا کافی سمجھا، تصوف کی اہمات کتب، ارباب تصوف کی مستند سوانح و سیر پڑھنے کی بجائے روایات و حکایات کے ناقابل اعتنا، مجموعوں اور غیر مستند ملفوظات وارشادات کے پسندوں اور کرامات و حکایات سے بھرپور کتابوں کا مطالعہ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے کافی جانا جو ہر اس سرائفہ صافی ہے، مجھے تصوف کے خلاف سینکڑوں کتابیں اور مقالات پڑھنے کا موقع ملا ہے لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کتابوں اور مقالات کے مولفین محترم نے ان کتابوں کو اپنا مافذ و مرجع قرار دیا ہے جو خود ارباب تصوف کی نظروں میں یکسر ناقابل اعتماد ہیں اور کسی صوفی یا بزرگ نے اپنی تحریریں ان کا حوالہ نہیں دیا، کسی کتاب کو صرف اس لیے قابل استناد جان لینا کہ اس کی تالیف و ترتیب کسی نامور بزرگ کے نام سے منسوب ہے، مدد درجہ ستم ظریفی ہے، کاش کہ ہم علمی ذمہ داری اور آخرت کی جوابدہی کا احساس کر کے اپنی رائے کا رخ متعین کرتے۔ مگر ایسا کیوں کرتے؟ اس کے لیے تو غیر معمولی محنت اور دیانت و رکاب تھی اور پھر وہیں ایک رائے قائم کر چکا تھا اب صرف رتے چڑھانے کی ضرورت تھی، سو اس کے لیے اہمات کتب کے بجائے ایسی ہی ناقابل اعتماد کتابیں معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ ملفوظات وارشادات کے جو مجموعے چھپے ہوئے ہیں ان میں صرف "قوائد الفواد" ہی ایک ایسا مجموعہ ملفوظات ہے جسے صوفیاء میں درجہ قبول حاصل ہے۔ یہ کتاب خواجہ نظام الدین دہلویؒ کے ملفوظات وارشادات پر مشتمل ہے، اسے آپ کے رفیق و مرید خاص امیر حسن علاء بخاریؒ المعروف خواجہ حسن دہلویؒ نے مرتب کیا ہے، خواجہ حسن دہلویؒ کے ہم عصر اور پیر بھائی امیر خسروؒ کے الفاظ ہیں:-

کاش میری ساری کتابیں سن لے لیتے لیکن یہ کتاب قوائد الفواد میرے قلم سے ہوتی۔

اس کے علاوہ ایک ضخیم مجموعہ "ہشت بہشت" کے نام سے چھپا ہوا ہے جس میں مخطوطات کی آٹھ کتابیں جمع ہیں جو علی الترتیب خواجہ عثمان ہارونیؒ کے مخطوطات خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ترتیب دی ہیں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ارشادات کو خواجہ بختیار کاکاؒ نے قلم بند کیا ہے، خواجہ بختیار کاکاؒ کی مجالس کی روداد خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ہاتھوں جمع ہوئی ہے اور خواجہ فرید الدینؒ کے اقوال کو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے مرتب کیا ہے اور یہ سلسلہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی اور خواجہ بدر الدین اسحاق ٹمک چلتا ہے، یہ پورا مجموعہ اپنے مندرجات و مضامین کے اعتبار سے محل نظر ہے، اس میں انیس الارواح، افضل الفوائد، راحت العاشقین، فوائد السالکین، اور دلیل العارفين وغیرہم رسالے شامل ہیں، اب اگر کوئی شخص محقق بن کر تصوف کی تعلیمات اور اباب تصوف کی سیرت پر تحقیق کے لیے ان رسالوں کو اپنا مرجع و ماخذ قرار دے لے اور لوگوں نے دیا ہے تو تحقیق کا جو شاہکار برآمد ہو گا وہ محتاج بیان نہیں، حالانکہ یہ وہ مجموعے اور رسائل ہیں جنہیں تصوف کے کسی عام حلقے میں بھی قبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ کچھ کہ خواص انہیں پسند کرتے۔ کتاب "فوائد الفوائد" اگر متصوفین کے ہاں مقبول و محبوب ٹھہری ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب واقعہ تعلیمات تصوف کی ترجمان ہے اور اس کے مندرجات کی مجموعی طور پر ذمہ داری لی جاسکتی ہے۔

یہاں ضمنی طور پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تصوف کے بارے میں غلط فہمیوں کی پیداوار میں ان کتابوں کا بھی خاصہ دخل عمل ہے جو عملی کے بجائے نظری تصوف کا ترجمان لیے ہوئے ہیں اور اسی مکتب فکر کی ترجمان ہیں جنہوں نے تصوف کو عملی تحریک اور روحانی انقلاب کے بجائے فلسفہ منطوق کی طرح ذہنی تعمیش کا رنگ دے دیا ہے اور تصوف جو اپنی تعلیمات و افکار کے لحاظ سے کھرا، سادہ، پرمغز،

سہل اور قرآن و سنت کا خلاصہ تھا، اس میں فلسفیانہ ادق اصطلاحات، منطق کے پیچیدہ گنجلک قواعد اور علم کلام کی موٹگافیاں اور نکتہ آرائیاں شامل کر دی گئیں جس سے تصوف عمل کی دنیا سے لکل کر قیل و قال کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ دل سے جلا وطن ہو کر دماغ کو اپنا مسکن بنا بیٹھا اور پھر اصلاح کی جگہ مناظرہ تعلیم کی جگہ مباحثہ، تلقین کی جگہ مجاہدہ، سوز و رول کی جگہ زبان کے چٹخارے اور روح کی تڑپ کی جگہ دماغ کے تعیش نے لے لی، نتیجہ یہ نکلا کہ معتولیوں اور فلسفیوں کے جامد و معطل، روح سے خالی، سوتیلے مکتب کے مقابلے میں ارباب تصوف نے جو خالق میں تیار کی تھیں، ان میں پہنچ کر انسان مشین نہیں جذبات و احساسات کے قالب میں ڈھل جاتا تھا، جہاں جذب شوق کے چراغ جلتے تھے، جہاں کیفیت اور ذوق کی قندیلیں روشن تھیں اور جہاں مستی و سرشاری کے قانونیں جگمگاتے تھے، رفت رفتہ بحث و مباحثہ اور چہنیں و چناں کا انداز لیے مکتب کے ماحول میں ڈھلتی گئیں اور پھر مکتب و خاتقاہ میں نام کے تغیر اور چند قدموں کے فاصلے کے سوا کچھ فرق نہ رہا۔ روح بھلائی نہ رہی مگر رسم اذان موجود، فلسفہ رہ گیا مگر تلقین غزالی مفقود، یہ اندازہ ہے، کہ ان کتابوں کو متعارف کرانے میں بھی اسی ذہن کا دامن چھتا ہے، جو تصوف کو ایک خاص رنگ میں دیکھتا اور لوگوں کو دکھانا چاہتا تھا۔ تاہم نہ محققین کو چاہیے تھا کہ ایسی کتابوں کو خواص کے حلقوں میں محض تحقیق و تدقیق اور اضافہ معلومات کے لیے وقف کر دیتے، ان کی کسوٹی پر اصل تصوف کو پرکھنے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ حق یہ ہے کہ تصوف تو نام ہی عمل کا ہے، اس کا بحث و نظر سے کوئی تعلق نہیں، بحث و نظر مکتب و اہل مکتب کا مشغلہ ہے، تصوف کا آغاز عمل سے ہوتا ہے اور انجام اخلاص پر، تصوف کیا ہے؟ قرآن و سنت کے اتباع اور اتباع میں اخلاص کا دوسرا نام ہے، حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں

شیخ ابوالحسن الفوشیؒ دم: ۳۴۸ھ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ: آج کل تصوف نام ہے بغیر حقیقت کے لیکن زمانہ، سابق میں یہ ایک حقیقت تھی بغیر نام کے اور داتا گنج بخشؒ اپنی طرف سے اضافہ کر کے کہتے ہیں:-

”سلف صالحین اور صحابہ کرام کے زمانہ میں یہ نام موجود نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی۔“

کتنی حقیقت افروز بات کہی ہے شیخ بخیرؒ نے، فی الواقع اگر تصوف کی اہمات کتب کا مطالعہ کیا جائے تو وہ قرآن و حدیث کی تفسیر میں اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ معلوم ہوتی ہیں، مگر عملی تصوف کی جگہ جب سے نظری تصوف نے لی تو مباحث کا دروازہ کھل گیا اور اصطلاحات کی ایک کھوپ تیار ہو گئی، چنانچہ جب ہم تصوف کی قدیم ترین اور اہمات کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے عنوانات و مباحث کچھ اس طرح ہیں، تقویٰ، اخلاص، صبر، شکر، توکل، توبہ، انابت، نفوت، یقین، استقامت، خوف، رجا، رضا، فقر، تواضع وغیرہم اور پھر ان عنوانات کی وضاحت اور تشریح کی گئی ہے، قرآنی آیات، احادیث نبویؐ سے اور پھر ان کی متابعت یا مطابقت میں بزرگان دین کے اقوال جو بجائے خود آیات و احادیث کا عطر و خلاصہ ہوتے ہیں، لیکن جب نظری تصوف پر مشتمل مضامین کی حامل کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس طرح کے ابجاث و عنوانات قائم ہوتے نظر آتے ہیں، لواحق، طوامع، لواحق، تلوین، تمکین، تبخی، تنخی، انزعاج، اصطلاح، دسم، رسم، معانی، ازلیہ، حقیقۃ الحقائق، قبض و بسط، علت و معلول، تنزیہ، تشبیہ، عینیت و غیرت، اور عین ثابتہ اور عین خارجیہ وغیرہم، ان اصطلاحات کا تعلق انسان کے اضافہ معلومات ذخیرہ الفاظ، جودت طبع، رسانی فکر، سلاست بیان اور طلاقت تحریر سے تو ہو سکتا ہے مگر اس کے اخلاق، روحانیت، اور اعمال سے ہرگز نہیں ہو سکتا، اس لیے چلیے

تھا کہ ان بحثوں کو چہار دیواری کے اندر رکھا جاتا اور یہ صغیرے کبرے صرف مکتب ہی میں ملائے جاتے، افسوس ایسا نہ ہوا اور ایک اخلاقی و معاشرتی تحریک ایک دانی و ذہنی انقلاب بھاری بھر کم اصطلاحات کے بوجھ تلے دب گیا، اور بعض بزرگوں کی باریک بینیوں و نکتہ آفرینیوں کی بعینہٗ چڑھ گیا، اس ماحول سے نکلنے والے اور تیار ہو کر آنے والے اچھے متکلم تو بن گئے مگر انسانیت کو متکلم کے بجائے معلم کی ضرورت تھی، بہترین مقرر و مناظر ہو گئے مگر مزی نہ بن سکے، اخلاق دانی تو آگئی، اخلاق داری نہ رہی، کتاب خوان کثرت سے وجود میں آ گئے مگر ”صاحب کتاب“ لوگوں کا تھپڑ لگیا سوز دماغ تو پیدا ہو گیا مگر سوز جلر پیدا نہ ہوا، دل و دماغ نے جب راہیں جدا کر لیں تو زندگی میں دورِ خاپن پیدا ہونا لازمی امر تھا، فکر و نظر ہم آہنگ نہ رہے تو زندگی میں تضادات کا ابھرنافطری تقاضہ تھا، سوایا ہو کر رہا، اے کاش ایسا نہ ہوتا۔

اب ہم اُن اہمات کتب کی تفصیل پیش کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان صحیح فیصلے پر آسانی پہنچ سکتا ہے اگر خدا توفیق دے اور محنت و دیانت کی عادت ہو تو یہ کتابیں پڑھیے اور پھر جو بھی رائے قائم کیجئے اس میں وزن ہوگا، لیکن یہ بات بھولے سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کتابوں میں سوائے قرآن و سنت کی تعلیمات کے اور کچھ نہ ملے گا، جن کتابوں کے پڑھنے کا مطالعہ کیا جا رہا ہے یہ تصوف پر قدیم اور مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں اور ارباب تصوف کے ہاں ان کا چلن عام اور ان کی حیثیت ایک دستور العمل کی سی ہے، پہلے ہم ان کتابوں کا نام معہ اُن کے مصنفین کے درج کریں گے اور بعد میں ان میں سے چند ایک کا ہلکا پھلکا تعارف اور اُن کے مضامین کا مختصر جائزہ لیں گے، مصنفین کے سنیں و وفات بھی احتیاط کے ساتھ درج کیے جا رہے ہیں تاکہ کتاب کی اولیت اور قدامت کا بھی پتہ چل سکے اور اُن کے مطالعہ میں ترجیحات بھی آسانی قائم کی جاسکیں، نیز ان کے اکثر مصنفین

وہ مشہور و معروف بزرگ ہیں جن سے عوام و خواص سب بخوبی واقف ہیں اور ان کی عقیدت کا دم بھرتے ہیں، یہ کتابیں محض اخلاق و روحانیت کی علمبردار نہیں بلکہ علم کا بھی شاہکار ہیں اور صوفیاء کرام کی علمی استعداد اور فکری صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

سن وفات	مصنف	نام کتاب
۲۴۳ھ	شیخ عارت المحامی	کتاب الرعایہ
۲۸۹ھ	شیخ ابوسعید خراز	کتاب العشق
۳۷۸ھ	شیخ ابونصر سراج	کتاب اللہج
۳۸۹ھ	شیخ ابوطالب مکی	قوت القلوب
۴۱۲ھ	شیخ ابوبکر بن ابوالحاق کلاباری	التعرف لمدہب اہل التصوف
۴۶۵ھ	شیخ ابوالقاسم القشیری	رسالہ قشیریہ
۴۷۲ھ	شیخ سید علی البحریری	کشف المحجوب
۴۸۱ھ	شیخ عبداللہ انصاری الرومی	صدر میدان
۵۰۵ھ	امام محمد غزالی	احیاء العلوم
"	"	کیمیائے سعادت
"	"	منہاج العابدین
۵۶۲ھ	شیخ عبدالقادر جیلانی	فتوح الغیب
۵۹۳ھ	شیخ ضیاء الدین سروردی	آداب المریدین
۶۳۲ھ	شیخ شہاب الدین سروردی	عوارف المعارف

یہ ہیں وہ کتابیں جنہیں تصوف کے حلقوں میں قبولیت عوام و خواص حاصل ہے، انہیں اگر تصوف کی "نصابی کتب" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، انہیں اگر عرق

ریزی اور توجہ انہماک سے پڑھا جائے تو نہ صرف یہ کہ الزامات کی قلعی کھل جائے گی۔ بلکہ تعقوف اپنی صحیح صورت اور اصلی ناک نقشے کے ساتھ ہمارے سامنے آجائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ تعقوف جسے اپنوں اور غیروں نے تمانوس اور اوق اصطلاحات کا طومار بنا دیا ہے وہ کتنا سادہ اور صاف شمر ہے، کتنا پرکشش اور جاذب ہے، اب اگلی چند سطور میں ان کتابوں کے چیدہ چیدہ اور مختصر عنوانات کے لیے وقت کی ہیں تاکہ ان کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے قبل ان سے ملکی سی روشناسی ہو جائے اور ایک قسم کی ذہنی مناسبت پیدا ہو جائے،

کتاب الرعاۃ

تحقیق کی رو سے دستیاب ہونے والی سب سے قدیم ترین کتاب ہے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً تمام مشاہیر صوفیاء نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر خوبصورت پیرائے میں کیا ہے، ان بزرگوں میں شیخ ابونصر سراج، شیخ ابوطالب مکی، شیخ ابوبکر کلاباذی، امام قیثری، داماد، جویری اور دیگر قداد اور ممتاز افراد شامل ہیں، امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" میں تو اس کی حیثیت مرجع، ماخذ اور سنگ بنیاد کی سی ہے، صوفیاء کے علاوہ مورخین اور متکلمین خطیب بغدادی (م: ۵۲۹ھ) نے تاریخ بغداد، شہرستانی (م: ۵۲۸ھ) نے الملل والنحل، ابن خلکان (م: ۶۸۱ھ) نے دنیات الاعیان اور الیافعی (م: ۶۸۱ھ) نے مرآۃ الجنان میں بھی اس کتاب کا ذکر خاص اہمیت سے کیا ہے۔

اس کتاب کے ابواب و عنوانات کچھ اس طرح ہیں، پہلے پانچ ابواب الرعاۃ لمعوق اللہ کے لیے وقف ہیں۔ چھٹا باب "توابعین" کے طبقات و اقسام اور توبہ کے طریقوں پر مشتمل ہے، باب ہفتم میں "استعداد لموت" کا بیان ہے یعنی یہ یقین

کہ اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کے لیے زاور راہ ہر وقت تیار رہنا چاہیے اور
 "بزن" سنتے ہی بلا تامل چل پڑنا چاہیے، پھر اگلی منزل (قبر) میں جو وحشت، تنہائی،
 تاریکی، اور کیڑے مکوڑوں کا گھر ہے، پڑاؤ کرنے کے لیے اپنی سہولت کی خاطر
 جملہ اسباب مہیا کر لینا چاہیے، اگلے چھ ابواب ریا، اور اس کی مختلف صورتوں
 کے لیے مخصوص ہیں، چودھویں باب میں اخلاص کی اہمیت اور ضرورت کو بڑی
 عمدگی اور خوبصورتی سے واضح کیا گیا ہے اور باقی جملہ ابواب ان مضامین و
 موضوعات پر مشتمل ہیں، حسد کی برائی، کبر کی مذمت، عجب کی ہلاکت خیزی، شیطان
 سے خدرو اجتناب کے طریقے، نیت کی تشریح، تواضع کی فضیلت اور آخر میں
 اس راہ کے راہی کے لیے ایک مبسوط اور مرتب نظام الاوقات ہے، جس کی پابندی
 سے وہ اصلاح نفس، ضبط نفس اور تزکیہ نفس کر سکتا ہے اور اپنے حقیقی
 مقصد زندگی کو پاسکتا ہے۔

کتاب الصدق

یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ شیخ فرید الدین عطار دم: ۶۲۰ھ نے اس
 کتاب کے مصنف کو "لسان الصدق" لکھا ہے، ضخامت کے اعتبار سے کم مگر
 معانی و معارف کے لحاظ سے یہ اہم کتاب صدیوں سے صوفیاء کے ہاں ایک مفید
 صحیفہ سمجھی جاتی ہے اس کتاب میں جس سادگی سے تعلیمات شرعیہ کو بیان کیا گیا ہے
 یہ اسی کا حصہ ہے۔ کتاب کا رنگ سوال و جواب کا سا ہے، ابتداء میں اخروی نجات
 کے لیے تین اصولوں کی پیروی کو ضمانت قرار دیا ہے، پہلا اصول اخلاص، دوسرا
 صدق اور تیسرا صبر ہے، اور ان تینوں کو ایک اکائی قرار دیا ہے اور ایک دوسرے
 کے لیے جزو لاینفک بتایا ہے، بلکہ یہ تینوں باہم الکمال و تکمیل کا ذریعہ ہیں اس کے

بعد پھر صدق کی تفصیلات پیش کرنے کے لیے متعدد فصلیں قائم کی ہیں، اخلاص میں صدق، صبر میں صدق، معرفت نفس میں صدق، دمع میں صدق، زہد میں صدق، توکل میں صدق، خوف و خشیت میں صدق، حیا میں صدق اور محبت و معرفت میں صدق، جب ان فصلوں کی تشریح کرتے ہیں تو بالالتزام اس ترتیب کا خیال رکھتے ہیں، اولاً آیت یا آیات قرآنی، ثانیاً احادیث نبوی، ثالثاً آثار و اقوال صحابہ کرام بالخصوص سیدنا صدیق اکبرؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کی سیرتوں سے استدلال و استشاد، اس بقامت کہتر مگر بقیمت بہتر کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد شکی سے شکی ذہن یکسو ہو جاتا ہے کہ فی الواقع تصوف محکم قرآن، فرمان رسولؐ اور اسوہ اصحابؓ کے علاوہ کچھ نہیں، طرالت کا خطرہ ہے ورنہ اس کتاب کے چند روح پرور اور یقین افروز اقتباسات پیش کیے جاتے :-

کتاب اللع

اس کتاب کا تعارف خود مصنف کے الفاظ میں یوں ہے :-
 "میرا مقصد یہ ہے کہ تصوف کے صحیح اصول و قواعد کی وضاحت کر دوں اور یہ ثابت کر دوں کہ یہ اصول کتاب و سنت سے مطابقت تامہ رکھتے ہیں اور اتباع رسولؐ و صحابہ ان کی غایت ہے۔"
 یہ کتاب بھی مابقی دو کتابوں کی طرح تصوف کے حقیقی خدو حال واضح کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے، مصنف نے اس کتاب کے ایک باب میں قرآن و سنت کو تصوف کا اصلی ماخذ قرار دیا ہے اور صوفیاء کے طریق استنباط کی وضاحت کی ہے، اس کتاب کی خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ مصنف نے دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے تصوف کے بارے میں دماغوں میں ابھرنے والے اعتراضات

کا بھرپور جائزہ لے کر غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے، اس کتاب کے ضمن میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مقامات پر اگرچہ مصنفؒ نے بعض صوفیاء کی شطہیات کی تاویل کر کے انہیں صحیح رخ دینے کی کوشش کی ہے، مگر اصولی طور پر آپ نے مسلک تصوف کو منقید بالکتاب والسنۃ قرار دیا اور تسلیم کیا ہے، اس کتاب میں ان تمام غلط عقیدوں، گمراہ کن نظریوں اور ذہنی اختراعات کا قلع قمع کر دیا گیا ہے، جنہوں نے تصوف کو ایک سنجیدہ علمی، فکری، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی تحریک کے مقام و منصب سے ہٹا کر باریچہ اطفال بنا دیا تھا مثلاً اتحاد و حلول کا باطل نظریہ نیز انہوں نے قرامطہ، باطنیہ اور اس کے دیگر فرق باطلہ کے تمام لغو عقیدوں کی تردید و غلطی کی ہے، اس کتاب میں تصوف کا وہی مفہوم پیش کیا گیا ہے جو پیشرو بزرگوں نے پیش کیا اور جو اس کا حقیقی مفہوم ہے، یعنی اتباع شریعت، ہم طوالت کے خوف سے بچنے کے لیے اس کے ابواب کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، ان سب کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔

التعرف لہذہب اہل التصوف

لولا التعرف لماعرف التصوف (اگر کتاب "التعرف" نہ ہوتی تو ہم تصوف سے آگاہ نہ ہوتے، یہ قول شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے تعارف کے لیے ایک فقرہ کافی ہے، اس کتاب کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جن کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے، جس میں اس کے ایجاز و اختصار مگر معانی و معارف سے لبریز ہونے کا خاصہ دخل ہے، یہ کتاب ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے لکھی گئی، جو منصور علاجؒ کے تختہ دار پر ٹٹکنے کے بعد تصوف کے بارے میں عوام

خواص کے ذہنوں میں پیدا ہو گئی تھیں، حق یہ ہے کہ مصنفؒ کے تقوف کے بارے میں سچے احساس، قلبی اخلاص اور کتاب کی متانت و بخیدگی نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے اور تصوف کے گرد آلود شیشہ کو یوں مصفیٰ کر دیا ہے کہ اس میں قرآن و سنت کے نقوش بڑے واضح اور روشن انداز میں دیکھے جاسکتے ہیں کتاب میں مصنفؒ نے زیادہ تر اسلاف صالحین کے اقوال نقل کیے ہیں اگر کہیں تشریح کی ضرورت پڑی ہے تو نہایت ہی مختصر مگر دلنشین انداز میں چند الفاظ لکھ دیے ہیں، اس کتاب کے اوّل میں صوفیوں کے عقائد و احوال کا ذکر کیا ہے، اور معرفت الہی، ایمان، خالق، ایمان، شرعی مذاہب، تقدیر و خلق، افعال، روح، شفاعت اور قرآن کے بارے میں تشریحات قلمبند کی ہیں لیکن اس کتاب کا اصل مقصد اور اس کا عطر و حصہ ہے جہاں تصوف کی تعلیمات پر مشتمل عنوانات باندھے گئے ہیں، تصوف کے متعلق بزرگوں کے اقوال جمع کرنے کے بعد اس کی تعلیمات کی تفصیل دی ہے۔ ان میں کچھ عنوانات یہ ہیں،

توبہ کے بارے میں صوفیاء کے اقوال، زہد کے بارے میں اقوال، صبر کے متعلق اقوال، فقر کے بارے میں اقوال، تواضع کے بارے میں اقوال، خوف کے بارے میں اقوال، تقویٰ کے بارے میں اقوال، اخلاص کے بارے میں اقوال، شکر کے بارے میں اقوال، توکل کے بارے میں اقوال، رضا کے بارے میں اقوال اور یقین کے بارے میں اقوال، مندرجہ بالا عنوانات کسی بھی لحاظ سے شریعت سے نہیں ٹکراتے بلکہ یہی اعمال و احوال شریعت کی روح اور غرض و غایت ہیں، تصوف کو سمجھنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی کتاب جامع اور مفید ہمیں اگرچہ رسالہ تشریح اور کیمیائے سعادت بھی بہت کارآمد کتابیں ہیں مگر اس کتاب کے اختصار نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں اور اسے بجا طور پر تصوف کا "انسائیکلو پیڈیا" کہا جاسکتا ہے، اس

کتاب کے آخر میں اگرچہ خاص قسم کی صوفیانہ اصطلاحات و کیفیات کا ذکر آگیا پھر بھی ان اصطلاحات کو اس دور کے تناظر میں دیکھنے اور اس کتاب کے بیان کی سادگی و صفائی کو پیش نظر رکھنے کے باعث طبیعت بوجھ اور وحشت محسوس نہیں کرتی، بلکہ ہلکے پھلکے انداز کی وجہ سے طبیعت ایک خاص قسم کا سرور اور ذوق محسوس کرتی ہے۔ ان اصطلاحات میں غیبت و شہود، تجلی و استتار، فنا و بقا، سکرو و محو، اور تجرید و تقرید وغیرہم شامل ہیں لیکن ان کے بارے میں جس انداز میں اظہار خیال کیا گیا اور جو اقوال پیش کیے گئے ہیں وہ اس قدر سچیدہ یا مشکل نہیں جس کے سمجھنے کے لیے سقراطی ذہن اور افلاطونی دماغ درکار ہو، ذرا سی توجہ سے ان کا مفہوم دماغ میں اتارا جاسکتا ہے، بہر کیف یہ کتاب جس طرح اپنے ادائل دور میں اہم تھی اب بھی اس کی اہمیت برقرار ہے بلکہ دوچند ہو گئی ہے۔

رسالہ قشیریہ

یوں تو اس کتاب سے پیشتر تصوف پر خاصا کام ہو چکا تھا مگر ابھی تک حسن ترتیب اور حسن تنوع کی حامل ایک کتاب کی ضرورت تھی، امام ابو قاسم قشیریؒ نے یہ کتاب لکھ اس ضرورت کو پورا کر دیا، اور جس بالغ نظری سے آپ نے یہ کام کیا آپ ہی کا حصہ ہے، امام نہ صرف ایک معروف صوفی ہیں بلکہ آپ کا شمار حفاظ حدیث میں بھی ہوتا ہے، اس لیے کتاب میں قرآنی آیات کے بعد جب احادیث کا حوالہ آتا ہے تو حوالے کی اہمیت اور دلچسپی اس وقت بڑھ جاتی ہے، جب احادیث اپنی سند سے پیش کرتے ہیں، اس کتاب کی اہمیت و وقعت کتنی ہے اس کا اندازہ تصوف و صوفیاء کے مخالفین کے سرخیل امام ابن تیمیہؒ کے اس قول سے ہو جاتا ہے۔

”اگر تصوف کا مطالعہ کرنا ہو تو رسالہ قشیریہ کا مطالعہ کیا جائے۔“

فارسی زبان میں سب سے اولین اور مستند تالیف شیخ علی ہجویری رحمہ اللہ کی ”کشف المحجوب“ ہے زبان بیان کے اعتبار سے سادہ اور واضح ہے، اس میں رسالہ قشیریہ کا جمع کیا گیا ہے یہ بھی رسالہ کی اہمیت کو واضح کرتے کے لیے ایک دلیل ہے یہ کتاب کیوں کر منصفہ تالیف پر آئی؟ اس کی وجہ خود مصنفؒ بیان فرماتے ہیں۔

”طریقت میں خلا پیدا ہو گیا ہے، نہیں بلکہ درحقیقت طریقت مٹ چکی

ہے، جن شیوخ سے لوگ ہدایت پاتے تھے گھر چلے ہیں اور اب وہ

نوجوان بھی کم پائے جاتے ہیں جو ان شیوخ کے اخلاق و سیرت

کی پیروی کرتے تھے، پرہیزگاری جاتی رہی اور اس کی بساط لپیٹ لی

گئی اور لالچ بڑھ گیا اور اس کی پٹانیں مضبوط ہو گئیں لوگوں کے دلوں

سے شریعت کا احترام اٹھ گیا، حلال و حرام میں تمیز کرنا چھوڑ دیا، لوگ

عبادات کے ادا کرنے کو حقارت سے دیکھتے ہیں، صوم و صلوٰہ کی اہانت

کرتے ہیں، غفلت کے میدان میں گھوڑے دوڑاتے ہیں اور اپنی خواہشات

کی تابعداری میں لگے ہوئے ہیں..... یہ لوگ اس قسم کی

بد اعمالیوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا کر خالق

اور احوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں..... وہ اس بات

کے مدعی ہیں کہ وہ حق پر قائم ہیں اور حق کے احکام جو ان پر جاری

ہوتے ہیں وہ تو محو ہو چکے ہیں چاہیں وہ کریں یا نہ کریں اللہ انہیں

عتاب و ملامت نہیں کرتا..... جب میں نے یہ دیکھا کہ

آج کل اللہ کی طرف سے ہماری آزمائش طول پکڑ چکی ہے.....

مجھے اس بات پر غیبت آئی کہ اہل طریقت کو برائی سے یاد کیا جاتا ہے

اور مخالفین ان پر نکتہ چینی کیے جانے سے لطف اٹھاتے ہیں.....
 میں امید کرتا تھا کہ اس خلا کے اسباب معدوم ہو جائیں گے
 لیکن مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کر
 بیٹھیں کہ طریقت کے قواعد کی بنیاد ہی انہی امور پر ہے اور ان کے
 اسلاف بھی اس قسم کی روش اختیار کرتے رہے، لہذا یہ رسالہ لکھ
 کر میں نے آپ لوگوں کو بھیجا۔

مصنف کی زبانی تصنیف کی غرض دعایت ہی بتا رہی ہے کہ رسالہ کن
 موضوعات و مضامین پر مشتمل ہوگا، جو شخص شرعی حدود کی پامالی، اخلاقی گراؤ،
 تقویٰ کے عدم لحاظ، حلال و حرام کی تمیز کے فقدان، بد اعمالیوں پر اصرار اور خواہشوں
 کی پیروی پر کڑھن اور دکھ محسوس کر رہا ہے وہ خود کس طرح ایسے مسلک کی تردید و
 اشاعت ایک مستقل رسالہ کے ذریعے کر سکتا ہے، جس مسلک کا شریعت
 سے کوئی تعلق نہ ہو، قیصری کے ہاں وہی تصوف رائج اور رائج ہے، جس کے نہ
 صرف ڈانڈے شریعت سے ملتے ہیں، بلکہ شریعت ہی کے سوتے سے اس کے
 فوارے پھوٹتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، یہ رسالہ متنوع اور وسیع الاطراف ہے، اس میں
 جہاں تعلیمات تصوف کا بیان ہے وہاں مشائخ کبار کی سوانح بھی ہیں ایک طرف
 اگر کرامت پر بحث کی گئی ہے تو دوسری جانب مرید کے لیے وصایا بھی مرتب
 کیے گئے ہیں، ہم چونکہ موضوع کو طول دینا پسند نہیں کرتے اس لیے رسالہ میں مندرجہ
 مضامین کا بالاستیعاب احاطہ نہیں کرتے بلکہ صرف ان ابواب کا ذکر
 کیے دیتے ہیں جو رسالے کا اصل لب لباب ہیں یعنی اخلاق و اعمال، جنہیں دیکھنے
 کے بعد ایک بار پھر یقین ہو جائے گا کہ تصوف واقعہ شریعت کے تنے سے

نکلی ہوئی ایک شاخ ہے، شیخؒ نے صوفیانہ اصطلاحات پر بھی لکھا ہے ان اصطلاحات میں وقت، مقام، حال، قبض، بسط، ہمیت، انس، تواجد، وجود، وجد، جمع، فرق، فنا، بقا، غیبت، حضور، صحو، سکر، محو، اثبات اور تلویح، تمکین وغیرہ شامل ہیں، لیکن انہیں پیچیدہ بنانے کے بجائے شیخؒ نے بڑی سادگی اور عمدگی سے ان کی تشریح کر دی ہے، ان ابجاث کو پڑھنے سے ایک شخص اپنی معلومات میں اضافہ محسوس کرتا ہے، اخلاق و اعمال کے سلسلہ میں ابواب کی تفصیل درج ذیل ہے :-

توبہ - تقویٰ - ورع - زہد - خوف - رجا - خشوع و تواضع - حسد - قناعت - توکل - شکر - صبر - اخلاص - صدق - فتوت - خلق اور فقر وغیرہم۔
رسالہ کے تعارف کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ فی الحقیقت، تصوف، قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔

صد سیدان

یہ کتاب اس جلیل القدر شیخؒ کی تصنیف ہے، جو بیک وقت محدث اور متصوف تھا، عربی ادب میں درک اور شغف کا یہ عالم تھا کہ ایک آیت کی تفسیر و تشریح کے وقت عربی کے چار چار سوا شعلہ کے زبانی حوالے دیا کرتے تھے، بارہ ہزار حدیثیں اسناد صحیحہ کے ساتھ یاد تھیں، آپ صرف محدث، لویب اور متصوف ہی نہ تھے بلکہ اس قافلہٴ سخت جان کے ایک فرد فرید تھے، جو ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ یہی کچھ آپ کے ساتھ ہوا، الزامات کی بوچھاڑ، مخالفین، طعن و تشنیع اور وہ سب کچھ جو راستے میں

رکاوٹ بن سکتا مگر آپ نے پامردی کے ساتھ یہ سنگلاخ وادی عبور کر ڈالی اور یوں ایک داستان رقم کر دی، قرآن و سنت کی ترویج و اشاعت آپ کی زندگی کا مقصد تھا، قلمی و ذہنی تبلیغ کا سلسلہ بھی عرصہ دراز تک جاری رکھا، زیر تبصرہ کتاب آپ کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے، آپ کے ایک مرید نے اسے مرتب کیا جس سے تصوف کی بلند پایہ اور بنیادی کتابوں میں ایک حسین اضافہ ہوا، اس کتاب میں "وصول الی اللہ" کے ان مقامات کا ذکر ہے جن سے گزر کر طالبِ صلاح اپنے مطلوبِ حقیقی کو پالیتا ہے، ہر مقام کی مناسب تشریح سے پہلے اکثر و بیشتر قرآنی آیات سے استناد کیا گیا ہے اور پھر ہر ایک کے ضمن میں تین تین نکات بیان کیے گئے ہیں، ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

صبر

"ساتواں میدان صبر ہے، قصد کے میدان سے صبر کا میدان نکلتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وان تصبروا خیر لکم (۲۵: ۴۰)

(اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا)

صبر کے تین ارکان ہیں :-

۱۔ مصیبت پر صبر کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اصبروا"

۲۔ مصیبت پر صبر کرنا جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وصبروا"

۳۔ طاعت پر صبر کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ورابطوا"

تکلیف پر صبرِ محبت کے باعث کیا جاتا ہے اور اس سے تین چیزیں برآمد ہوتی ہیں :-

اسی انداز میں دوسرے سومیدانوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں، توبہ، انابت، مروت، فتوت، صبر، محاسبہ، زہد، تقویٰ، یقین، بصیرت، توکل، رضا، اخلاص، بتکل، اخلاص، عزم، استقامت، تفکر، تذکر، فقر، تواضع، خوف، خشوع، رجا، احسان، صدق، صفا، حیا، ایثار، تفضل، توحید، علم، حکمت، وغیرہم۔

یہ کتاب مصنف کی شرف نگاہی اور نکتہ رسی کا عمدہ شاہکار اور طالبین دین کے لیے ایک روحانی اور اخلاقی سوغات ہے۔

منہاج العابدین

امام غزالیؒ کے دوسرے دور کی تصنیفات میں سے احیاء العلوم، کمیا سادات اور منہاج العابدین ہمارے پیش نظر ہیں، دل تو یہ چاہتا ہے کہ ان تینوں عظیم و ضخیم اور نہایت ہی گراں قدر کتابوں کا جائزہ لیا جائے، لیکن طوالت کا خوف دامنگیر ہے اس لیے ممکن نہیں، البتہ طبیعت میں یہ کش مکش برپا ہے کہ جائزہ اور تعارف کے لیے کس کتاب کا انتخاب کیا جائے جبکہ ہر کتاب اپنی جگہ پر درجے بہا اور گوہر نایاب ہے، ”احیاء العلوم“ پر نظر پڑتی ہے تو اس کی عظمتوں کا کنارہ نظر نہیں آتا، یہ وہ عظیم المرتبت اور ضخیم کتاب ہے جو بعض محققین کے نزدیک اس دور کی تصنیف ہے، جب امامؒ پر جذب و شوق کی کیفیت طاری تھی، اس کتاب کو شیخ علیؒ نے پچیس مرتبہ حرفاً حرفاً پڑھا اور ہر مرتبہ خاتمے پر ایک عام دعوت کا اہتمام کیا۔

”شیخ محی الدین اکبرؒ احیاء العلوم کا مطالعہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔“
 ”کمیا نے سعادت“ سامنے آتی توبہ دامن کھینچ لیتی ہے، آخر وہ کتاب کتنی بلند پایہ

ہوگی جسے خود مصنف کیلئے سعادت قرار دے رہا ہے، اس کتاب میں کوئی ایسا رکن باقی نہیں رہا جو اصلاح اخلاق و معاشرت کے لیے ضروری ہو، مگر اس میں درج نہ کیا گیا ہو، بناء پر یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ اس کا بھرپور جائزہ لیا اور تعارف حاصل کیا جائے، مگر یہاں وہی خوف طوالت ہے جو قلم کی عنان کھینچ لیتا ہے۔ یہی تیسری کتاب ”منہاج العابدین الیٰ جنت رب العالمین“ تو یہ وہ کتاب ہے جس کے بارہ میں مصنف خود رقمطراز ہیں:-

”اَسْ (اللہ تعالیٰ) نے اپنے فضل و کرم سے عبادت کے عجیب و غریب اسرار و رموز پر مطلع فرمایا اور مجھے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا الہام فرمایا، ایسی ترتیب میں کسی اور کتاب کی تصنیف میں قائم نہیں کر سکا۔ یہ وہ تصنیف ہے جس کی میں خود تعریف کرتا ہوں۔“

امام غزالیؒ کی یہ آخری تصنیف ہے، جسے بجا طور پر امامؒ کے افکار کا آئینہ کہا جاسکتا ہے، امامؒ نے اس کتاب میں سات گھاٹیوں کا ذکر فرمایا ہے، جنہیں عبور کر کے انسان خدا کی جنت میں داخل اور قرب خداوندی سے سرفراز ہو سکتا ہے ان گھاٹیوں کی ترتیب اس طرح ہے۔ پہلی گھاٹی علم، دوسری توبہ، تیسری موافق و موافق، چوتھی عوارض، پانچویں بواعث، یعنی عبادت پر ابھارنے والی چیزیں، چھٹی قواعد یعنی عبادت میں خرابیاں پیدا کرنے والی اور ساتویں حمد و شکر، پھر ان کی تشریح میں اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ پہلے قرآنی آیات سے استناد کیا گیا، پھر احادیث نبویہ نقل کی گئیں، پھر اس کے بعد ضروری توضیح و تشریح کر دی گئی، یہ کتاب اس قدر مرتب، مربوط، مسلسل اور پرکشش ہے کہ راقم الحروف کے تجربے و مشاہدے کے مطابق پوری کتاب پڑھے بغیر کروٹ بدلنے کو جی نہیں چاہتا، کیونکہ جب یہ کتاب لکھی گئی تو اس وقت مصنف محمد بن محمد نہیں بلکہ

امام غزالیؒ تھا، جامعہ نظامیہ کا قال اتولی مدرس نہیں بلکہ اخلاقیات کا معلم تھا مکتب کا خشک فاضل نہیں بلکہ بیاباں نور دی کر کے فاروقی و سلماقی روح اپنے اندر بیدار کر چکا تھا، اس کا علم "یقینہ" میں نہ تھا بلکہ اب سینے میں آچکا تھا، منہاج العابدین کا مصنف کتاب لکھتے وقت "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت کے مقام پر تھا، تو پھر کیوں نہ کتاب میں تاثیر کشش اور عمل پر ابھارتے والی کیفیت پیدا ہوتی، کتاب کے ایک مقام پر داعیانہ اور مصلحانہ رنگ ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں،

"کیونکہ دونوں قسم کے ظاہری و باطنی احکام کے متعلق ایک ہی رب نے ایک ہی کتاب میں حکم دیا ہے، مگر تم باطنی اور اوصاف سے مطلقاً بے خبر ہو چکے ہو اور ایسے لوگوں کے لیے فتوے لکھتے ہیں مصروف، مجنہوں نے دنیا ہی کو کعبہ مقصود ٹھہرا لیا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے نیکی کو برائی کا اور برائی کو نیکی کا درجہ دے دیا ہے انہیں تم ایسے لوگوں کے لیے فتویٰ نویسی میں مشغول ہو کر پاکیزہ علوم سے بے پروا ہو گئے ہو، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں نور، حکمت اور ہدایت وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے اے بھلائی کے دعویدارو! تمہیں اس کا خوف نہیں کہ بڑے بڑے فراتض کو پس پشت ڈال رہے ہو اور نفل نماز روزہ میں مشغول ہو، فراتض سے تارک ہو کر نوافل ادا کرنے والو! ان نوافل کی کوئی وقت نہیں۔"

قارئین جان گئے ہوں گے کہ امام غزالیؒ کس قسم کے تصوف کے علمبردار ہیں، تصوف کو مسلک مسک کہا جاتا ہے ذرا انصاف کا دامن تھا میسے اور دیانت کو آواز دے کیسے کیا یہ "مسلک مسک" ہے یا "مذہب محو" ہے، واجبات شرعیہ کی

ادائیگی اور فرائض کی سرانجامی کے لیے یہ تڑپ، یہ بے قراری، یہ سوز اور یہ درد "سکر" کی غمازی کر رہا ہے یا صحران کی!

فتوح الغیب

یہ کتاب اس نامور اور مشہور زمانہ بزرگ کی تصنیف ہے جسے غوثِ اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے نام نامی اہم گرامی سے یاد کیا جاتا ہے، یہ وہ عظیم المرتبت شخصیت ہے جسے عوام و خواص دونوں طبقوں میں لازوال شہرت و عزت حاصل ہے، آپ کی خدماتِ جلیلہ کا جائزہ لیا جائے تو آپ پر محی الدینؒ کا لقب صحیح معنوں میں صادق آیا ہے، آپ نے واقعہ اسلام کی غوطے کھاتی کشتی کو ساحل پر پہنچا دیا، اس مردِ مولا نے جھوپڑی میں بیٹھ کر اس انداز میں دلوں پر حکمرانی کی کہ رطبے رطبے بادشاہوں نے تحت و سپاہ کے باوجود بھی اس طرح فرمانروائی نہ کی ہوگی، اس ایک دھود سے اسلام کو آتنا فائدہ پہنچا جس کا مقابلہ ہزاروں لاکھوں انسانی نفوس نہیں کر سکتے، آپ نے تزکیہ باطن، تصفیہ قلب، اصلاح اخلاق و اعمال، ترویج شریعت، اشاعت اسلام اور استیلائے حق کا اس قدر بھاری کام سرانجام دیا کہ ایک زمانہ انگشت بندھاں ہے، آپ کی یوں تو متعدد تصنیفات و تالیفات ہیں اور ہر تصنیف و تالیف اپنی جگہ قابل قدر اور اہم ہے مگر ان میں "فتوح الغیب" جیسی مختصر مگر جامع کتاب کو ایک خاص منزلت اور اہمیت حاصل ہے، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ افسانہ حیرت میں لکھتے ہیں۔

"یہ چند کلمات ہیں جو فتوح الغیب سے مجھ پر ظاہر ہوئے، دل میں اتر گئے اور بھر گئے۔ پھر راستی حال نے ان کو باہر لاکر ظاہر کیا اور اللہ کی رحمت و مہربانی سے ان کلمات کو میرے دل اور راہِ حق کے طالبوں کی

رہنمائی کے لیے قالبِ گفتہ صحیح میں ظاہر کرنے پر میری مدد فرمائی۔
 یہ کتاب اٹھتر مقالات پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ حکمت و موعظت کا خزینہ
 بے بہا ہے، جس کی سادگی اور دل میں کھب جانے والے انداز میں شیخؒ نے بات
 کی ہے یہ سلیقہ شائد ہی کسی کو آتا ہو، یہ کتاب جہاں ایک ظرف و غلط و نصیحت
 سے لبریز اور معنوی محاسن سے بھرپور ہے وہاں اس کے الفاظ کا درو بست، صحیح
 انتخاب اور ہر عمل استعمال اس کتاب کو ایک ادبی شہ پارہ بنا دیتا ہے، مقالے
 کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، یہ ساتواں مقالہ ہے، عنوان ”اذہاب غم القلب“ یعنی
 دل کی پریشانی کیوں کر دور ہو، فرماتے ہیں:-

”ہر چیز اللہ کو سونپ دے اور اپنے دل کے دروازہ پر اللہ کا دربان
 بن جا، وہ دل میں آنے کا جسے حکم دے اُسے آنے دے اور جسے منع
 کرے اسے روک دے پس ہوائے نفس کو دل سے نکل جانے کے
 بعد پھر دل میں نہ آنے دے۔“

اس کتاب کے مقالات کے مضامین یہ ہیں:-

مقالہ ۱ بہتر کاموں کی نصیحت، مقالہ ۱۳ احکام خداوندی مان لینے
 کا بیان، مقالہ نمبر ۱۵ خوف ورجاء، مقالہ ۱۶ توکل اور اس کے مقالات،
 مقالہ ۱۸ نزول بلا پر شکایت نہ کرنے کی تاکید، مقالہ ۲۳ باب الہی کو مضبوط
 پکڑنے کی تاکید، مقالہ ۲۴ خیر و شر دو میوے ہیں، مقالہ ۳۱ خدا کے لیے بعض
 اور محبت کرنا، مقالہ ۵۳ خوشنودی الہی طلب کرنے کی تاکید، مقالہ ۵۴ عمل پر
 مغرور نہ ہونے کی تاکید، مقالہ ۵۵ آٹھ خصلتوں پر تصوف کی بناء ہے۔

یہ تھا فتوح الغیب کا اجمالی تعارف، اب قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ شیخؒ
 عارف مجاہد ہیں یا ابوسعید خرازؒ، امام قشیریؒ ہوں یا داتا گنج بخشؒ، امام غزالیؒ

ہوں یا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ان سب کا تصوف کیا تھا؟

کشف المحجوب

عربی میں تصوف کی قدیم ترین کتاب جس طرح کتاب الرقاعۃ ہے اسی طرح فارسی میں تصوف کی قدیم ترین کتاب کشف المحجوب ہے، اور تصوف پر روضہ پاک و ہند میں لکھی جانے والی پہلی کتاب یہی ہے، اس کتاب کے مصنف سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ ہیں، داتا ہجویری کو مسلمانان پاک و ہند میں جو عظمت و شہرت حاصل ہے ایسی مثالیں تاریخ میں غل غل ملتی ہیں، جیسا کہ رسالہ قشیریہ کے تعارف میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت داتا ہجویریؒ نے اپنی تالیف و تصنیف کے لیے اپنے قریبی معاصر امام ابوالقاسم قشیریؒ کے رسالے کو نمونہ قرار دے کر اس کا تتبع کیا مگر کشف المحجوب کی انفرادیت اپنی جگہ قائم اور مسلم رہی اور وہ یوں کہ امام قشیریؒ نے اپنی کتاب میں زیادہ تر متقدمین کے حوالوں پر اکتفا کیا ہے اور ان کے اقوال و حوال کو کافی سمجھا ہے مگر محدوم ہجویریؒ نے اپنی تالیف میں مجتہدانہ اور محققانہ طرز اختیار کیا ہے، اس میں آپ نے ذاتی مشاہدات و واردات کا ذکر کر کے کتاب کی ثقاہت اور دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے، ایک سائل نے تصوف کی ماہیت سمجھنے کی غرض سے کچھ سوالات کیے آپ نے جواب کے طور پر یہ محققانہ اور لاجواب کتاب قلمبند فرمادی،

اس کتاب کے مندرجات اور عنوانات اس کا بہترین تعارف ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آئمہ صوفیاء کن رجحانات کے حامل تھے، عنوانات کی ایک جھلک بول کی حسن ترتیب اور مضامین کا تنوع ملاحظہ ہو۔

پہلا باب : ماہیت علم، علم کے اقسام، معرفت و شریعت، سلفطائیفہ، اہل تصوف کے اقوال۔

marfat.com

Marfat.com

دوسرا باب: اثبات فقر، صوفیوں کی بزرگی، فقر و غنا سے متعلق اہل تصوف کے اقوال۔

تیسرا باب: تصوف، لفظ صوفی سے کیا مراد ہے؛ معنا

ساتواں باب: صحابہ کرام، مناقب و فضائل۔

آٹھواں باب: اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

نواں باب: اہل صفیہ، حالات و مناقب۔

چودھویں باب سے کشف کا سلسلہ چلتا ہے، ان میں اسلامی تعلیمات کا

عطر اور خلاصہ آگیا ہے۔ مثلاً

کشف حجاب اول: معرفت حق، عقل و معرفت، حقیقت معرفت، رموز معرفت۔

کشف حجاب دوم: توحید، توحید کے تین پہلو، توحید کا تصور۔

کشف حجاب سوم: ایمان، ماہیت ایمان، ایمان۔ اصل اور فرع، معرفت اور عبادت،

ایمان اور جبر و قدر۔

کشف حجاب چہارم: طہارت، ظاہری و باطنی طہارت۔

پندرہواں باب: توبہ، توبہ سے متعلقہ امور، گناہ کی یاد، توبہ کی تین صورتیں،

الغرض یہ کتاب تصوف کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں متنوع پھول سجے

ہیں ہر پھول کا رنگ جدا اور خوشبو منفرد، کتاب میں مخدوم بحوریؒ نے ان نام نہاد صوفیاء کا

تعاقب کیا ہے جو اس بباد سے میں تصوف کی بدنامی اور صوفیاء کی رسوائی کا باعث بنتے

ہیں یہ کتاب علم و عمل کا ایسا حسین مرقع ہے جس کی ہر دور میں ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جادہ

حق پر چلنے کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد یہ

دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تصوف کو سمجھنے کے لیے اسی ایک کتاب کا مطالعہ کافی ہے، جس

سے تصوف کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور کوئی الجھن باقی نہیں رہتی،

اشاعت اسلام اور صوفیاء کرام

صوفیاء کرام کے بارے میں گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کا جو تاثر ہے، منجملہ دیگر تاثرات کے یہ بھی غلط ہے، اگر انصاف کی نظر سے صوفیاء کرام کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے، تو صوفیاء کی زندگی آرام و آسائش، عاقبت اور اطمینان کی نہیں بلکہ جدوجہد اور کشمکش کی زندگی دکھائی دیتی ہے، نامساعد فضا، ناسازگار ماحول، نامالوس آب ہوا اور ناخوشگوار حالات میں دینی و ملی فرائض کی انجام دہی صوفیاء کرام کا کام ہے، کٹھن حالات میں جو سخت کام صوفیاء کرام نے کیا ہے، اس کا تصور بھی انسان کو لرزا دیتا ہے اور صوفیاء کرام کی محنت، سخت کوشی اور اخلاص و ایقان کا قائل بنا دیتا ہے برصغیر پاک و ہند میں اشاعت اسلام کا سہرا صوفیاء کرام کے سر ہے، صوفیاء کی کوششوں کا ذکر کیے بغیر برصغیر کی اشاعت اسلام کی تاریخ تکمیل نہیں ہوتی لیکن جن حالات میں صوفیاء نے اشاعت اسلام کا کام سرانجام دیا اسے وہی شخص جان سکتا ہے جسے ہندوستان کی اخلاقی اور معاشرتی حالت کا کما حقہ علم ہو، خداؤں کی حد سے برامی ہوئی کثرت، جنسی خواہشات کی بھرائی کیفیت، طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات کی لعنت کے دور میں توحید پرستی کا درس، ضبط نفس کی تلقین اور انسانی وحدت و اخوت کا پیغام جس جاں گسل اور صبر آزمائش کا متقاضی ہے اسے ہر شخص بخوبی جانتا ہے اور صوفیاء نے یہی کچھ کیا ہے، دلوں میں ایک خدا کے لیے جذبہ عبادت اور

محبت، کردار میں پاکیزگی اور عفت اور انسانوں کے مختلف طبقات میں وحدتِ موت پیدا کر کے صوفیاء نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔
اس وقت کے ہندوستان کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کیا تھی؛ ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔

”ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم کچھ اس طرح تھی، برہمن (مذہبی پیشوا) کھتری (لڑنے والے) دلش (زراعت و تجارت پیشہ) اور شودر (خادم و غلام)۔“

ان کے درجات پیدائش کیساتھے؛
”قادرِ مطلق نے دنیا کی یہودی کے لیے اپنے منہ سے، اپنے بازوؤں سے، اپنی رانوں سے اور اپنے پاؤں سے برہمن، کھتری، دلش اور شودر کو پیدا کیا۔“

ان کے ذمے کیا وظائف تھے؛
”برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے چڑھاوے دینا فرض قرار دیا۔“
”کھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، وان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور خواہشات نفسانی میں نہ پڑے۔“
”دلش کو اس نے حکم دیا کہ مولیٰ کی سیوا کرے، چڑھاوے چڑھائے تجارت، لین دین اور زراعت کرے۔“

”شودر کے لیے قادرِ مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا وہ ان تینوں کی خدمت کرتا ہے۔“

چھوت چھات کی کیا کیفیت تھی؛

marfat.com

Marfat.com

”اگر شود کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس کو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کہو نہ ہوا تیل اس کو پلایا جائے۔“

کہتے، بلی، مینڈک، کوئے اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔“ ۱۷

اس ماحول میں انسانی مساوات اور وحدت کا پیغام جہاں ایک طرف انقلاب آفریں تھا وہاں حیات بخش بھی تھا، جہاں اپنے اندر بے پناہ مشکلات اور مصائب رکھتا تھا وہاں پسپائی اور دبی ہوئی قوموں کے لیے مشرورہ جانفز بھی تھا، صوفیاء کرام اپنے مشن میں کس قدر کامیاب ہوئے، اس کا جواب اگلے صفحات میں آ رہا ہے، تاہم دعوتِ اسلام کا مختصر سا جائزہ سر ولیم ہنٹر کے حوالے سے پروفیسر آرنلڈ کی زبانی سنئیے، لکھتے ہیں :-

”ہنگال کے، ان مفلس لوگوں کے لیے جن میں ماہی گیری، شکاری، ہندی قزاق اور نیچ ذات کے کاشتکار شامل تھے، اسلام ایک نعمت عظمیٰ تھا، جو ان پر عرش بریں سے اُترا، اسلام حکمران قوم کا مذہب تھا اور اس کے پر جوش مبلغ خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا مشرورہ لے کر ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جس کو سب لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا،“ ۱۸

پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع صوفیاء کرام کی تبلیغی مساعی اور خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کے حالات و کوائف کے بارے میں لکھتے ہیں،

”یہاں کے لوگ ان مبلغوں سے انتہائی اختلاف رکھتے تھے، ان کی زبان اہل ملک سے انتہائی مختلف، ان کا دین ان سے بالکل مختلف غیروں کو یہاں والے پیچھے کہتے تھے، ان سے میل جول، شادی بیاہ،

قربت، ہم نشینی، کھانا پینا سب کو ناجائز سمجھتے تھے، مسلمانوں سے رسوم و عادات میں ان کا اختلاف اس حد تک تھا کہ بقول البیرونی ”وہ اپنے بچوں کو ان سے، اُن کے لباس سے اور ان کی شکل و صورت سے ڈرایا کرتے تھے۔“

حضرت سید علی البھیری المعروف داماد گنج بخش ”کشف المحجوب“ میں لکھتے ہیں۔
 ”اس وقت میں دیار ہند کے شہر لاہور میں ناہنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔“
 سیر الاولیاء میں جابجا خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اور آپ کے مریدوں کے سانپوں سے ڈسے جانے کا بار بار ذکر ملتا ہے جب خواجہ فرید گنج شکرؒ شیخ کے حکم سے اجودھن تشریف لائے اور اسے تبلیغ و وعظ کا مرکز بنایا تو اس وقت اجودھن کی اخلاقی، علمی اور مذہبی حالت کیا تھی؟ حامد بن فضل اللہ جمالیؒ لکھتے ہیں،
 ”وہ ایک خراب مقام تھا، وہاں آرام کیا، اس قصبے میں لوگ زیادہ تر خراب طبع، بد مزاج اور بد اعتقاد تھے۔“

تبلیغ و اشاعت اسلام کے مرکز کی عمارت کیا تھی؟ سہولتیں کیسی تھیں؟ رہائش کا بندوبست کس طرح تھا؟ اور کھانے پینے کے ذرائع کیا تھے؟ ملاحظہ فرمائیے۔
 ”قصبہ سے باہر کچھ درخت تھے، ان میں سے ایک بڑا درخت دیکھا اس درخت کے نیچے کھیل بچا دیا اور عبادت الہی میں مشغول ہو گئے۔“
 خواجہ نظام الدین فرماتے ہیں۔

”حضرت خواجہ فریدؒ نے پیلو پر گزارہ کیا۔“

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے جب جادہٴ رشد و ہدایت پر قدم رکھا اور اللہ کا نام لے کر اللہ کا کام شروع کیا تو کن مشکلات اور دشواریوں سے گزرنا پڑا، آپ بیتی کا ایک مدق۔

میرے پاس ایک دانگ بھی نہ ہوتا کہ اس سے میں روٹیاں خرید کر خود کھاؤں اور والدہ، ہمشیرہ اور گھر کے ان لوگوں کو کھلاؤں، جو میری کفالت میں تھے، خربوزہ کی ارزانی اور فراوانی کے باوجود پوری فصل گزر جاتی اور خربوزہ چکھتا نصیب نہ ہوتا۔

حالات کی یہ ناسازگاری، مگر اشاعتِ اسلام کی بیقراری، بزرگانِ دین کو چین نہ لینے دیتی، بھوکے پیٹ خشک تالو، پیاسے ہونٹوں، ٹوٹے بوریلے اور شکستہ حالت میں کیا کلر نامے سرانجام دیے، تاریخ کو آج تک اس پر ناز ہے، ناسازی حالات کے باوجود ان نیک طبیعت انسانوں کے منہ سے جو کچھ نکلتا، دل پر پڑتا، الفاظ جتنے سادہ ہوتے تاثیر اتنی زیادہ ہوتی، ان کے قول و عمل کی ہم آہنگی لوگوں کو پیکرِ عمل بنادیتی برصغیر پاک و ہند کی حدود میں داخل ہونے والے پہلے مبلغِ اسلام اپنی جملہ بے سروسامانی کے ساتھ وہ کام کر گئے جو شاہِ امدادارے بھی سرانجام نہ دے سکتے، ان کی نسبت پر فیبر آرڈر رقمطراز ہیں۔

”ابتدائی دور کے بزرگان میں سے ایک بزرگ شیخ اسماعیلؒ ہیں جو بخارا کے ساداتِ عظام میں سے تھے اور دینی و دنیوی علوم میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے مبلغِ اسلام تھے جو ۱۲۹۵ھ میں لاہور شہر میں وارد ہوئے اور وہاں تبلیغِ اسلام میں مصروف ہوئے، ان کی مجلس و عظیم لوگ بکثرت شریک ہوتے تھے اور نو مسلموں کی تعداد ہر روز بڑھتی جاتی تھی، کہتے ہیں کہ جو شخص ان کے وعظ میں ایک مرتبہ آ جاتا وہ اسلام قبول کیے بغیر نہ جاتا تھا“۔

ہندوستان میں تبلیغِ اسلام کا سب سے زیادہ کام خواجہ معین الدین حسن بخاریؒ نے سرانجام دیا اور آپ کے خلفاء کی بے پناہ کوشش سے

ہندوستان کا چہرہ چہ نور اسلام سے منور ہو گیا، آپ کے اثرات مسلمانوں میں آج بھی نسلاً بعد نسل موجود اور لوگوں کے دل آپ کی عقیدت سے معمور ہیں، آپ نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے خطہ ہند کیوں منتخب فرمایا؟ یہ ایک دلچسپ اور ایمان افروز داستان ہے، اقتباس ملاحظہ فرمائیے،

”مشورے سے جب خواجہ صاحب مدنیہ منورہ کی زیارت کے لیے گئے تو وہاں آپ کو ہندوستان کے کفار میں تبلیغ اسلام کا حکم ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور ان سے فرمایا: خدا نے ہندوستان کا ملک تیرے سپرد فرمایا ہے، وہاں جا اور اجیر میں سکونت اختیار کر خدا کی مدد سے دین اسلام تیرے اور تیرے ارادتمندوں کے تقویٰ سے اس سرزمین میں پھیل جائے گا۔“

چنانچہ آپ نے اجیر کو اپنا مرکز بنایا، راجپوتانہ اور ملحقہ علاقوں میں تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دیں، نتیجہ یہ نکلا کہ بشارت کے مطابق ہندوستان نور اسلام سے جگمگا اٹھا اور سلسلہ پشتیہ کو مقبولیت نصیب ہوئی کہ کسی دوسرے کے لیے ایسی مقبولیت شاید و بائد،

قال میں تاثیر اور حال میں کشش کا یہ عالم تھا کہ جس طرف نظر اٹھ جاتی تمام کر جاتی جا گئے کوچے بسا آئے، پروفیسر آرٹلڈ لکھتے ہیں:-

”جب آپ اجیر جاتے ہوئے راستے میں دہلی ٹھہرے تھے تو وہاں آپ نے ساتھ سو ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا۔“

آپ کے سلسلہ عالیہ سے منسلک اور آپ کے محبوب و مقرب خلیفہ خواجہ بختیار کاکیؒ کے فیض یافتہ اور مشہور بزرگ خواجہ مسرید الدین گنج شکرؒ نے پنجاب کی سولہ قوموں کو مسلمان کیا۔

خواجہ فرید اللہ آپ کے خلفاء و خدام کی تبلیغی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے
پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع رقمطراز ہیں:-

شیخ فرید الدین گنج شکرؒ اور آپ کے سریدوں کی سعی مشکور سے تمام
پنجاب نور اسلام سے منور ہو گیا۔ سیال جو پنجاب کے مغربی میدانِ ہلاکت
کی نہایت اہم اقوام میں سے ہیں اور غالباً پنوار راجپوت ہیں ان کا مورثہ
اعلیٰ پاک پٹن میں جناب بابا کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لایا اور اُس
کی قوم نے بھی اسلام قبول کیا، سیال قوم جنگ، لٹکان، گجرات، مظفر گڑھ
اور دیگر اضلاع میں پھیلی ہوئی ہے۔"

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی خدمات دین کو ایک ہندو مفکر رائے بسا اور
ہر بلاس شدہ واکس نظر سے دیکھتا ہے، اس کی رائے پڑھیے۔

خواجہ معین الدینؒ نے پرہیزگاروں کی زندگی بسر کی.... انہوں نے
زیادتی کرنے کی تمعین کبھی نہیں کی اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت اُن
کا نقطہ نظر صلح اور خیر خواہی کا تھا۔"

خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سلسلہ اس قدر وسیع اور موثر تھا کہ ہندوستان کا
کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جہاں آپ کے خلفاء، خدام اور فیض یافتہ افراد نہ پہنچے ہوں اسلام
کی تبلیغ کا حق ادا نہ کیا ہو، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدینؒ اور دونوں
اہل دل بزرگوں نے اس معاملے میں حیرت انگیز اور انتہائی کامنڈا ہر کیا، برصغیر کا
ایک ایک مسلمان بچہ ان کا منون و مشکور ہے، گجرات، دکن، اور بنگال میں جو بزرگ
اسلام لے کر گئے ان میں مولانا حسام الدین عثمانيؒ مولانا کمال الدینؒ، شیخ برہان الدین
غریبؒ اور مولانا سراج الدین عثمانؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہ سب بزرگ خواجہ نظام الدین
چشتیؒ کے خلفاء میں سے ہیں۔

شیخ ابواسحاق گازرونیؒ کی تبلیغی و اصلاحی کوششوں کا کوئی احاطہ نہیں، نہ جانے ان آنکھوں میں وہ کونسی مقتا طبعیت بھری تھی کہ جس جانب اٹھتیں، پروں کے پرے کھینچے آتے، جنہوں نے ایک بار ان کی حلاوت گفتار کا مزہ چکھا، زندگی بھر شہد کی مٹھا یاد نہ آئی، ہزاروں نمونوں اور تراویں میں وہ سرور کہاں جوان کے بے تکلف الفاظ میں ہوتا تھا، ہزاروں کتابیں وہ کچھ نہ کر پائیں جوان کے ایک جملے نے کر دکھایا، بغیر چلے کھینچے تیر کا کعب جانا یہ معنوم ان کی محفل میں سمجھ آیا، اٹھی، گری اور بیٹھ گئی پھر کیا ہوا، دل کی کایا پلٹ گئی، خزیۃ الاصفیاء کے مولف کی گواہی ملاحظہ کیجئے۔

”شیخ گازرونیؒ کے دستِ حق پرست پر چوبیس ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور ایک لاکھ کے قریب مسلمان تائب اور حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔“

اقبالؒ نے سچ کہا ہے۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہے تو دیکھ ان کو

یدِ بیضیا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

شیخ اسماعیلؒ جن کا ذکر ہم پہچنے کر آئے ہیں رشتہ میں لاہور تشریف لائے، ان کی مجلس میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا اور ہر روز صد ہا لوگ خلعت اسلام سے مشرف ہوئے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو آپ کو شراز و اکثر شیخ اکرم مطبوعہ فیروز سنز ص ۵۷

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سید حلال الدین بخاریؒ کی آمد بہت اہمیت رکھتی ہے، اوج کی قدیم اور تاریخی خانقاہ کی بناء آپ کے ہاتھوں ہوئی، اس جگہ میں منگل آپ کے دم قدم سے ہوا، اوج کا قصبہ ایک عظیم روحانی اور سیاسی مرکز بنا رہا، آپ تقریباً ۱۲۴۲ھ میں اوج تشریف لائے اور آتے ہی روحانی و علمی فیض کا چشمہ جاری کر دیا، دور دراز سے لوگ آتے رہے اور فیضیاب ہوتے رہے، اس خانقاہ سے

نہ جانے کتنے تبلیغ کام، شاد کام، کتنے تشناب سیراب، کتنے گم گشتہ راہ راہ یاب اور کتنے محروم فیضیاب ہوئے، آپ کے روحانی اثرات دور دور تک محسوس کیے گئے آپ کے پوتے سید احمد کیر المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے پنجاب کے کئی قبیلوں کو مسلمان کیا تھا۔

حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے بنگال میں قدم رکھتے ہی اپنی سرگرمیوں کا آغاز کس طرح کیا؟ پروفیسر محمد ایوب قادریؒ لکھتے ہیں۔

”وہاں رشد و ہدایت کا ہنگامہ برپا کر دیا، خانقاہ احمد مسجد کی تعمیر کی اور لشکر خانہ جاری کر دیا، بہت سے مسلمان حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور خاص طور پر وہ ہندو اور بدھ جو نہایت پستی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے، حضرت تبریزیؒ کے ہاتھوں مشرف باسلام ہوئے۔“

حضرت ابوعلی قلندرؒ جو عراق عجم کے رہنے والے تھے، تیرھویں صدی کے اخیر میں پانی پت اگر سکونت اختیار کی اور سو سال کی عمر پا کر ۷۳۷ھ میں انتقال کیا، آپ نے اپنے مواعظ حسنہ سے خواص و عوام دونوں کو متاثر کیا اور اس حکمت و محنت سے تبلیغ اسلام کا کام کیا کہ دونوں میں معاشرے کا رنگ بدل گیا، ادا سر کی پیروی اور لوہی سے اجتناب کا دور دورہ ہونے لگا، ایک طرف غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہونے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں میں جو معاشرتی اور اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کا استیصال شروع ہو گیا۔

پروفیسر ضیاء الدین برنی کے الفاظ میں :-

شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس پاک کی برکت اور ان کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کی طرف مائل اور شیخ کی ارادت کی طرف راغب ہو گئے، سلطان علاء الدین

اپنے تمام گھروالوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا خواص و عوام کے دل نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہدِ علانی کے آخری چند سالوں میں شراب و شہاد، فسق و فجور، قمار بازی، فحاشی کا نام بھی آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا، اب کبیرہ گناہ مسلمانوں کو کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے، مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہ ہو سکتے تھے اور خوف کے مارے دکانداروں سے بھوٹ، کم تولنے اور ملاوٹ کا رواج اٹھ گیا تھا۔^{۱۰۹۶}

حضرت مجدد الف ثانیؒ جن کا نام حریت و حق پرستی کا مترادف المعنی لفظ بن گیا ہے آپ کے صاحبزادے اور روحانی میراث کے وارث خواجہ محمد معصوم سرہندی المتوفی ۱۰۹۶ھ کے ہاتھ پر نو لاکھ انسانوں نے بیعت اور توبہ کی۔^{۱۰۹۷}

صدر الصدور شیخ عبدالنبیؒ جو دور اکبری کی عظیم علمی اور روحانی شخصیت گزرے ہیں، آپ نے جس جرات، محبت اور دلسوزی سے اسلام کی تبلیغ، اوامر کی ادائیگی اور نواہی سے پرہیز کی تلقین فرمائی اسے تاریخ اسلام میں ممتاز مقام حاصل ہے، آپ کی تلقین کا اثر تھا کہ اکبر بادشاہ (مغل اعظم) نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اذان خود دیتا اور مسجد کی صفائی خود کرتا تھا۔^{۱۰۹۸}

حضرت شاہ غلام علی المتوفی ۱۲۳۰ھ، جو پہلی صدی کی ایک ممتاز روحانی شخصیت ہیں، خاندانِ مجددیہ دہلی میں بیٹھ کر حق کی شمع فرزوں کی اور طالبانِ صادق پر وائے کی طرح کھینچے چلے آئے، اگر اقبالؒ کے شعر کا جامہ کہیں راست آتا ہے تو بلاشبہ شاہ غلام علی کی قامت پر آتا ہے،^{۱۰۹۹}

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغان ہے مردِ خلیق

چشم دیدگواہوں کا بیان ہے کہ آپ کی خانقاہ میں پورب اور پچیم اور مغرب اور مشرق کے لوگوں کا ہجوم رہتا، بلا مبالغہ میسوں، شہروں کے ارباب ارادت بیک وقت آپ کی مجلس میں موجود رہے اور آپ کی مجلس پر میلے کا گمان گزرتا سرسید احمد خان آثار الفوائد کے باب چہارم میں اپنی آنکھوں دیکھی کہانی بیان کرتے ہیں :-

”میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر سویت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح اٹھتے تھے“

حضرت شاہ روف احمد مجددی دارالمعارف میں صرف ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست میں لکھتے ہیں جو ۲۸ جمادی الاول ۱۲۳۱ھ کو دہلی کی خانقاہ مجددیہ میں استفادہ کے لیے حاضر تھے، اب شہروں کے نام ملاحظہ فرمائیے :-
”سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امرتسر، سنبھل، رامپور، بریلی، لکھنؤ، گورکھ پور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدر آباد، پونہ وغیرہم“

اب ہم آخر میں، خاورِ نقوف کے رخشندہ آفتاب حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی تبلیغی کوششوں کا مختصر جائزہ لے کر اپنے عنوان کو ختم کرتے ہیں حضرت شیخ نے تحریر اور تقریر دونوں سے اسلام کی جو گراں بہا خدمات سر انجام دی ہیں ان کی گھن گرج ہزار سال گزرنے کے باوجود برقرار ہے، اگر مقبولیت انام اور محبوبیت عوام کو کسی کی عظمت و ہر و عزیز کی کا معیار مان لیا جائے تو حضرت شیخؒ کی ذات اس

پر پوری اترتی ہے، کسی کمنے ولسے نے سچ کہا ہے کہ آپ کی آمد اسلام کے افسردہ
چمن میں بادِ بہاری کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے ہر گل رنگ و بومیں نہا گیا، اس
مرد قلندر نے ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر وہ کچھ کیا جو تخت و سریر پر بھی انجام نہ پاسکتا، آپ
ہی کی نظر کا اعجاز اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ مندی آنکھیں یک بیک کھل گئیں، کانوں کا
بوجھ ہٹکا ہو گیا، دل کا غلاف اتر گیا، لغزیدہ قدم سنبھل گئے، ہبکی فکر سدھ گئی، دھندلا
ذہن صاف ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظر حق نما، کان حق آشنا اور دل خود آگاہ
بن گئے، ایک زمانہ گواہ ہے کہ حضرت شیخ کے ہاتھوں قطرے دریا اور ذرے صحرا
بن گئے، بے راہ ہادی اور مردے میجا بن گئے، یہ داستان کسے یاد نہیں، مال
لوٹنے آئے تھے دل لٹا بیٹھے۔

حضرت شیخ کے معتمد اور ممتاز شاگرد حضرت عبداللہ جبائی روایت کرتے ہیں۔
حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے۔

”ایک لاکھ آدمیوں سے زیادہ عیاروں اور ڈاکوؤں نے میرے ہاتھ پر
توبہ کی اور پانچ ہزار سے زائد یہودی مسلمان ہوئے“

مندرجہ بالا دلائل اور حوالہ جات کے ہوتے ہوئے یہ بات کتنی بے وزن ہو جاتی
ہے کہ صوفیاء کی زندگیاں گوشہ نشینی اور عزلت نشینی میں گزریں، امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر کا کام محتاج تکمیل رہا مگر صوفیاء، زیادہ عباد اپنے مراقبوں میں مست
رہے، کفر و باطل کا تسلط بڑھتا رہا۔ مگر ارباب تصوف حق ہو کی ضرروں میں مشغول
رہے، لوگ دین سے دور ہوتے چلے گئے لیکن اصحاب طریقت دنیا کے کشف و کرمیت
میں کھوئے رہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جملہ اہل اسلام ان بے نوائف و نفعیروں کے ممنون احسان ہیں
جن کے مدد سے ان کے دل نور اسلام سے منور ہوئے ورنہ کیا خبر آج ہم کسی مند

میں دیوی کے چرنوں میں آلتی پالتی مارے بیٹھے اس کی ڈنڈوت بجالا رہے ہوتے۔
 پہلے سے قائم شدہ زائے کا کوئی علاج نہیں ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ان
 فرقہ پوشوں نے سختی اور نرمی، سردی اور گرمی میں جس جاں سوزی کے ساتھ
 لوگوں کی تعلیم و تربیت، اصلاح عقائد و اخلاق اور تزکیہ قلب و نفس کا اہتمام
 کیا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کی زندگی محض سائنس کی آمد و شد نہ تھی بلکہ
 ایک بیکار مسلسل تھی، باطل کے خلاف، کفر کے خلاف اور فساد کے خلاف، جہد
 مسلسل تھی، سر بلندی حق کے لیے اور رب کعبہ کی قسم وہ اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

آئینِ جوانِ مرزاں حق گوئی و بے باکی

اپنوں اور غیروں کے قلم اور کلام کی تان بیاں باگر ٹوٹتی ہے کہ مذہبِ نقیصہ
انسان کو ترک و تحسود، گوشہ نشینی، عافیت پسندی، زندگی سے گریز، مسائل
حیات سے فرار، رہبانیت، سہل کوشی اور یاس و ناامیدی کی تعلیم دیتا ہے، اربابِ
نقصہ سرخسب اپنے من میں مست رہتے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ مسائلِ زندگی
کیا ہیں؟ تمدنی و معاشرتی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ نظامِ مملکت کیسے چل رہا ہے، معاشرہ
میں کہاں کہاں اور کون کون سی خرابیاں رونما ہو چکی ہیں؟ ان کا سدِ باب کیسے ممکن
ہے؟ رعایا کے حقوق کیا ہیں اور سربراہِ مملکت کے فرائض کیا ہیں؟ امر بالمعروف
کی دین میں اہمیت اور نہی عن المنکر کی وقعت کیا ہے؟ غرض ایسے سوالات پیدا
کیے جاتے ہیں جو سارے نہیں تو اکثر یا تو اپنے دماغ کی اختراع ہوتے ہیں یا غلط
فہمیوں کی پیداوار، کہا جاتا ہے، صوفیاء اپنے جھوٹوں میں رہے، انہیں کیا معلوم
اربابِ حکومت عوام پر کیا مظالم ڈھارہے ہیں؟ وہ حق ہو کی گردانوں میں مصروف
انہیں کیا خبر کہ حدودِ الشہ کو کس بیدردی سے پا مال کیا جا رہا ہے؟ وہ مجاہدوں و
مکاشفوں میں منہمک، کیا جانیں کہ اقامتِ دین کی تحریک اور اس کے تقاضے
کیا ہوتے ہیں؟ وہ طویل قیام و سجود اور رکوع و تشهد میں مشغول، انہیں کیسے پتہ
چلے کہ جہادِ زندگی کیا ہے؟ یہ ہیں وہ باتیں جو لمبے اور پیرائے بدل کر اور ٹپٹا لپٹ

کر کی جاتی ہیں۔

کاش! اعتراض کرنے، الزام دھرنے اور منفی فیصلہ کرنے سے پہلے صوفیا، کرام کی زندگیوں کا بھرپور مطالعہ کیا ہوتا اور اصل ماحول کی طرف رجوع کیا ہوتا، پھر پتہ چلتا کہ کٹیا میں رہنے والے ان بزرگوں نے کتنے ایوانوں میں زلزلے برپا کیے، ان ترقی پسندوں نے کتنے سربراہوں کو لرزہ بر اندام کیا، ان کی عقابانی نگاہوں نے کن کن کا پتہ پانی کیا حق کے ان غیور و محسوس فقیروں نے کتنے بادشاہوں کے چہروں پر شکنیں ابھاریں، ان جانباز اور سرسروش مجاہدوں نے پروانے کی خاموشی کیساتھ کس اداسے اپنی جانیں نذر محبت کیں، یہ لوگ پایادہ سکندرانہ جلال اور قلندرانہ ادائیں لے کر کہاں کہاں پہنچے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا، کن زہرہ گداز اور جگر پاش حالات سے گذر کر انہوں نے حق کا علم بلند کیا، کتنے ایسے کج کلاہ ہوئے جن کی تندی و نخوت کو اپنے پاؤں پر رکھا، سینکڑوں واقعات ہیں جہاں ان بزرگوں نے گردن جھکانے پر کٹوانے کو ترجیح دی، لیکن یہ حقائق تو اس وقت اپنی اصل شکل میں ہمارے سامنے آتے جب ہماری آنکھوں پر رنگین شیشے نہ ہوتے جھپٹت یہ ہے کہ یہ لوگ نہ صرف "جہاد زندگانی" کی اصل رمز سے آگاہ تھے بلکہ ان کی زندگانی سراسر جہاد سے عبارت تھی، جہاں انہوں نے گلی کوچوں میں تبلیغ و نصیحت کی دہاں بڑے بڑے ایوانوں میں بھی آوازہ حق بلند کیا اور اس قوت، شدت، اخلاص اور بے نیازی سے حق کا پرچار کیا کہ انبیاء کی میرتیں نظروں میں گھوم گئیں، دل میں وہی جذبہ، نظروں میں وہی بے باکی چہرے پر وہی اعتماد و سکون، زبان پر وہی کھڑے جملے، بیان میں وہی طعنہ، انداز میں وہی دلولہ، عمل میں وہی اخلاص، طبیعت میں وہی قناعت و توکل اور چال و حال میں وہی بے نیازی جو منصب نبوت کے مالین کی سیرتوں میں دکھائی دیتی ہے انہوں نے نہ صرف بگڑے نوابوں، بدست جاگیرداروں

جابر و ظالم بادشاہوں، بے لگام حکمرانوں، نخوت و کبر میں چور رئیسوں، عیش و عشرت میں غرق ہمارا جوں اور بے ضمیر وزیروں کو لٹکارا اور برسرِ عام لٹکارا بلکہ ان کی تنقید کا ہدف وہ علما بھی بنے جو اپنے عالی منصب سے قردتہ، بادشاہوں کی کارہیسی اور جاگیرداروں کی خوشامد کو اپنا دین سمجھے ہوئے تھے، ان فقہاء پر بھی برسے جنکی قبائلی اُن کے فتویٰ فردشی کے باعث بے گناہ خون سے لہڑی ہوئی تھیں، ان مفتیوں کا تعاقب کیا، جن کی حیلہ جوئیوں، دسیسہ کاریوں اور فریب ساز یوں کی وجہ سے دین بازیچہ اطفال بن کر رہ گیا تھا، اُن زاہدوں کی بھی خبر لی جو کج خمولی میں مسائل زندگی سے بے خبر تصوراتی دنیا میں گم سم تھے، جنہیں کسی بیوہ کے سر سے دوپٹا ترنے، کسی کی بیٹی کے پیر بن نہنے، کسی یتیم کے اُجڑنے اور کسی غریب کے لٹنے کا کوئی احساس نہ تھا وہ خطیب بھی ان کی حق گوئی کی سان پر چسٹا رہے، جن کے خطبے خشک، دغظا بے تاثیر، تقریریں بے روح اور مقلد بے جان تھے، جن سے نہ آنکھوں میں عشق کا سرور اور نہ چہرے پر یقین کا نور پیدا ہوتا، المختصر صوفیوں کا مقدس گروہ جہاں جہاں پہنچا، تبلیغ و نصیحت کا حق ادا کرتا، حق گوئی کے پرچم گاڑتا، میاکی کے پھریرے لہراتا اور اخلاص و سوز کے نشانات چھوڑتا گیا۔

صوفیاء کرام کو جہاں کوئی خلافِ شرع کام نظر آیا فوراً ٹوکا، جہاں قرآن و سنت سے تجاوز کا رجحان دیکھا سیدراہ بن گئے، جہاں بدعت کو سراٹھاتے پایا۔ وہیں کھل دیا، جہاں کوئی بات دین اسلام کے منافی سامنے آئی اس کے استیصال کی بھرپور کوشش کی، جب بھی اور جہاں بھی محسوس کیا کہ خدا کی حدود اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو نظر انداز کیا گیا ہے، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کون اس فعل کا مرتکب ہے، فوراً نیا م زبان سے شمشیر حق نکالی اور نخوت و کبر سے بھرے کلاہ داروں انا نیت و غرور سے سرشار عامہ پوشوں، کروفر کے نشے میں

دھت سر پر آراؤں کی اکڑی گردنیں ہوائیں اچھال دیں اور ان کی تندی خاک میں ملا دی، جب اور جہاں موقع ملاحق کی بات سنا دی، بادشاہوں کو مرصع اور مست ہاتھیوں پر زندگار ہودج میں بیٹھے خدام و خشم کی فوج کے جلو میں سیر کرتے دیکھا تو میں پیغام حق نشر کر دیا، بھرے دربار میں چوہداروں کے درمیان تخت و تاج سے آراستہ و پیراستہ جلوہ افروز دیکھا تو حق بات کہنے میں تامل نہ کیا، بادشاہوں نے بلوا کر نصیحت چاہی تو چلے گئے، اگر انہوں نے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں تو بھی دروازوں پر دستک دے آئے، حق گوئی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا، تو بہر طور نبھایا خواہ کوسے یار میں موقع ملایا سوئے دار جانا پڑا، اب ہم ان تاریخی حقائق کا حساب اٹھ لیتے ہیں جن سے یہ معلوم کرنا آسان ہو جائے گا کہ واقعہ صوفیاء کرام نے تبلیغ حق اور نفع خیر کا فریضہ بڑی بے باکی اور جوانمردی سے سرانجام دیا اور حق گوئی و بے باکی کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی جو نظام مصطفیٰ کے علمبرداروں کے لیے بجا طور پر مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔

خواجہ فرید الدین عطارؒ نے لکھا ہے، ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اپنے مستند وزیر فضل کے ہمراہ حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ کے در دولت پر حاضر ہوا، اور دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون؟ وزیر نے جواب دیا: امیر المومنین خواجہ فضیلؒ نے فرمایا، امیر المومنین کا مجھ سے کیا کام؟ اور مجھے ان سے کیا واسطہ؟ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت واجب ہے، فرمایا مجھے حیران نہ کرو، وزیر نے کہا اندر آنے کی اجازت دو، ورنہ ہم حکما اندر آجائیں گے فرمایا اجازت تو نہیں دیتا، حکما اندر آ سکتے ہو چنانچہ خلیفہ اور وزیر اندر آ گئے، خواجہ فضیل نے چراغ گل کر دیا تاکہ ہارون الرشید کو نہ دیکھ سکیں، اسی اشارے میں ہارون کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے چھو گیا، فرمایا کیسا نرم ہاتھ ہے، کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے، خلیفہ نے درخواست کی، کچھ

ہدایت فرمائیے، جواب دیا، تیرا باپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اس نے درخواست کی تھی کہ مجھے کسی صوبے کا حاکم بنا دیا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یا عم بدک نفس (یعنی اسے چچا تجھے تیرے نفس کا امیر کیا، ہارون الرشید نے کہا کچھ اور فرمائیے، فرمایا یہ ملک تیرا گھر ہے اور رعایا تیری اولاد، ماں باپ کے ساتھ نرمی، بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے بچیوں سے نیک سلوک کر، اگر کوئی مفلس برطیارات کو بھوکے سو جائے گی تو قیامت کے دن وہ بھی تیری دامن گیر ہوگی اور تیرے ساتھ جھگڑے گی۔

اس واقعے میں بیک وقت بادشاہوں سے بے نیازی، امرا و وزرا سے بے رغبتی، مملکت کی ذمہ داریوں کو باحسن پورا کرنے کی تلقین، وعظ و نصیحت اور فکر آخرت نمایاں ہے، شفیق سے شفیق باپ بھی اتنی نرمی اور پیار سے بیٹے کو زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ نہیں کرتا ہوگا، جتنی شفقت اور محبت سے خواجہ فضل نے ہارون الرشید کی رہنمائی فرمائی، دینی اخوت، ایمانی ہمدردی اور انسانی مروت لفظ لفظ سے پسلی پڑتی ہے، زبان سے ادا ہونے والا ہر حرف اخلاص و سوز لیے ہوئے اور انداز دامن میں اپنائیت سموئے ہوئے ہے، رہا یہ سوال کہ خلیفہ و وزیر کے آنے پر دروازہ نہ کھولنا یا اند آسنے کی اجازت نبویا اخلاق و مروت کے خلاف ہے، تو اس کے بارے میں بادی تاہل تہہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ فقیروں کے وہ دروازے جو ہر اپنے غیر کے لیے ہر وقت کھلتے، ہر عامی و خاص کے لیے دھکتے ہیں وہ ہارون یا فضل پر کیسے بند ہو سکتے ہیں لیکن اس میں تبلیغ و نصیحت کا پہلو تھا اور یہ باور کرانا مقصود تھا کہ حق کے علمبردار کبھی قریب شاہی کے لیے بے قرار نہیں ہوتے، یہی وہ بے نیازی ہے جو بات میں قند و نبات، اور قنوت و تری میں شہد و شیر کی مٹھاس بھر دیتی ہے اور دل کے لوبے کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب

کھینچ لیتی ہے، یوں ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے ہیں، اس واقعے کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس الزام میں کتنا وزن باقی رہ جاتا ہے کہ صوفیا، کرام کو ملک اور ملکی حالات کی کچھ خبر نہیں ہوتی، لہذا کہ انہیں دلچسپی ہو، عباسی خلافت ہی کے ایک تاجدار خلیفہ المنصور کا واقعہ ہے، حضرت سفیان ثوریؒ نے حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں خلیفہ المنصور کو پکڑ لیا اور کہا۔

”امیر المومنین! حضرت عمرؓ نے ایک حج کے عام مصارف پر سولہ دینار خرچ کیے تھے، آپ نے خدا اور امت محمدیہ کا بے شمار مال بغیر اجازت صرف کیا ہے، آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ منصور لا جواب ہو گیا بعد میں انہیں (سفیان ثوریؒ) سلسلہ حکومت میں منسلک کرنا چاہا تو وہ رولوش ہو گئے۔“

نامور، ذمی جاہ، طاقتور اور باہمیت حکمران کے منہ آنے والا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا، خلیفہ راشد ثانیؒ کے طریقے سے ہٹنے پر ٹوکنے والا، جوابدہی کا احساس ابھارنے والا، امت محمدیہ کی امانت یاد دلانے والا اور منصب حکومت کو ٹھکرانے والا کون تھا؟ یہ اسی کردہ کا نامور فرزند تھا جو آج تک طعن و تشنیع کے چر کے سہتا آ رہا ہے کہ صوفیاء عافیت کو ش، خلوت پسند اور امور دنیا سے گریزاں ہوتے ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر، پورے خراسان کا حاکم تھا، نمود و نمائش کا رسیا اور زرق برق لباس پہننے کا دلدادہ، جب نکلتا تو خدام و حشم کی فوج لے کر نکلتا، چوہداروں کی ایک جماعت ہٹو، بچو! کی صدا میں بلند کرتی، شاہانہ کرد و فراس کی ایک ایک بات سے ٹپکتا تھا، اسی نوع کی ایک تقریب میں امام غزالیؒ نے اسے خطاب کر کے کہا۔

”افسوس! مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوقائے زیریں کے بار سے نہ سہ

امام غزالیؒ بھی ان جفاکشان و ستم رسیدگان میں سے ہیں جن کے مذہب کو ”عزیمیت“ کے بجائے ”عافیت“ کا مذہب کہا جاتا ہے، آج امام غزالیؒ سلطان بنجر کے منہ آیا ہے، کل ہی غزالیؒ جامعہ نظامیہ (بنداد) میں قتلِ اقول کی بحثوں میں معروف، منطق و فلسفہ کی گتیاں سلجھانے میں مشغول، علمِ کلام کے تفسیروں اور کلیوں میں منہمک اشاعرہ و معتزلہ کے نظری مسائل میں محو تھا، یہ وہ زندگی تھی جو حرلیوں کے بقول معاملاتِ زندگی میں دلچسپی سے بھرپور زندگی تھی، معاشرتی و منصبی ذمہ داریوں کے احساس سے معمور زندگی تھی، مگر کتب کی فضا سے باہر غزالیؒ نے کیا کیا تھا؟ حق گوئی کا داعیہ ابھرا، امر بالمعروف کا جذبہ اٹھا، منی عن المنکر کا دلولہ پیدا ہوا تو کب؟ جب غزالیؒ قریب پویشوں کی صف میں شامل ہوا اور درویشوں کے کدواں سے آطا۔ خود آکاہی کے آداب، فلسفہ و منطق نہیں عشق سکھاتا ہے اور یہی عشق ان بے لواؤں کا سرمایہ حیات اور حاصلِ زندگی ہے، یہی عشق دنیا کی تنگ و تاریک وادیوں سے نکال کر دین کی سرسبز و شاداب اور وسیع روشوں پر چلنا سکھاتا ہے، غزالیؒ کے پہلے دور میں فلسفہ اور اس دور میں تلقین نمایاں ہے۔

جب بھی صوفیاء کرام نے دیکھا کہ اقتدار کی امانت کو نا اہل ہاتھوں کے سپرد کیا جا رہا ہے اور عوام کی گردنوں پر فاسق و فاجر کو بٹھایا جا رہا ہے تو ان کا ردِ عمل کیا تھا؟ اس سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک واقعہ ہماری بہترین رہنمائی اور حقیقت حال کی وضاحت کرتا ہے، جب خلیفہ معتقنی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفاء یحییٰ کو منصب قضا سونپا، تو اس واقعہ پر احتجاج کرتے ہوئے ایک اجتماع میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے برسرِ منبر خلیفہ کو سخت الفاظ میں مخاطب کر کے

فرمایا :-

”تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے، جو اَظْلَمُ الظَّالِمِینَ ہے،
کل قیامت کے دن اس رب العالمین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا
جواب دو گے۔“

شیخ عبدالقادر جیلانی کی شخصیت جہاں، متنوع، ہمہ جہت اور عظیم ہے وہاں
کاروانِ ولایت کے سالار کی حیثیت رکھتی ہے، ہزاروں انسانوں جتنا کام اس
مردِ خدا نے تنہا ماحول کی ناسازگاری اور بادرِ مخالفت کی تندی کے باوجود کر دکھایا
افسوس کہ اس مردِ مولا کو جہاں زندگی میں فضا ساز گار میسر نہیں آئی وہاں وفات کے
بعد بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، آپ کی کرامات کے چرچے تو زبانِ زدِ
عام و خاص ہیں مگر کسی کو خدمات کا علم شاید و باند ہو، حالانکہ آپ کا وجود اسلام
کے لیے بادرِ بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں غنچے کھلا دیے اور علمِ اسلام
میں ایمان اور روحانیت کی نئی لہر دوڑ گئی، آپ نے اگر ایک طرف بادشاہوں کا دامن
پکڑ کر چھوڑا تو دوسری جانب ان عمامہ پوشوں کا تعاقب بھی کیا، جن کی علمی و اخلاقی
کمزوریوں کے باعث سلاطین و حکامِ دین کے معاملہ میں جبری اور بے خوف ہو
گئے تھے، ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرمایا :-

”اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو، تمہیں ان سے کیا نسبت ہے؟ اے
اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو! اے راہزنو، تم کھلے ظلم اور نفاق میں
میں مبتلا ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے عالمو، اے زاہد و شاہانِ
سلاطین کے لیے کب تک منافق بنے ہو گے، کہ ان سے دنیا کا
زرد مال اور اس کی شہوات و لذات لیتے ہو، تم اور اکثر بادشاہ اس
زمانے میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظلم اور

خائن بنے ہوئے ہیں۔“

شیخ کے اس خطاب میں اسلام کی غیرت، ایمان کی حمیت، مسلمانوں کی فلاح کی تڑپ، راہِ حق سے ہٹے ہوؤں کی اصلاح کے لیے بے قراری، تفاق و ہندگی، زرد مال اور کتمانِ حق کے استیصال کے لیے بے چینی، آسانی ملاحظہ کی جاسکتی ہے، شیخ برہان الدین غریبؒ کے خلیفہ شیخ زین الدینؒ (م : ۸۰۱ھ) کے معاصر والی دکن سلطان محمد شاہ بہمنی کا دور عروج و اقبال ہے اور اسی رو میں منہیات شرعیہ کا ارتکاب کر بیٹھا، جس پر شیخ زین الدینؒ نے افسوس، غصے اور قلق کا اظہار فرمایا، ۱۰۶۷ھ میں جب سلطان فاتحانہ دولت آباد میں داخل ہوا تو حضرت شیخ کو پیغام بھیجا، یا تو آپ خود دربار میں حاضر ہوں، یا میری خلافت کی تحریر اپنے دستِ خاص سے میرے پاس بھیجیں، شیخؒ نے چونکہ سلطان کو منہیات شرعیہ کا مرتکب پایا تھا اس لیے نہ حاضری روا بھی نہ تحریر خلافت جائز جانی، بہر حال جواب دینا تھا دیا، وہ ملاحظہ کیجئے یہ جواب، حق کے میاں کا نہ اظہار و عطا و نصیحت، تنبیہ و تفہیم اور بے نیازی پر مشتمل تھا، آپ نے پہلے ایک حکایت سنائی پھر اپنا مدعا ظاہر فرمایا:

”ایک مرتبہ کسی تقریب سے ایک عالم، ایک سید اور ایک سیحڑا کافروں کے ہتھے چڑھ گئے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں بت خانہ میں لے چلیں، جو بت کو سجدہ کرے گا اس کی جان بخشی کر دی جائے گی پہلے عالم کو لے گئے، انہوں نے اضطرابی حالت میں، قرآن مجید کی رخصت پر عمل کیا، اور بت کو سجدہ کر کے جان بچالی، سید نے عالم کی پڑی کی جب سیحڑے کی باری آئی، اس نے کہا، میری ساری زندگی ناشائستہ کاموں میں گذری، میں نہ تو عالم ہوں اور نہ سید کہ ان میں سے کسی فضیلت کی پناہ میں ایسا کام کروں۔ اس نے قتل ہو جانا منظور کر لیا

مگر بت کو سجدہ نہ کیا :-

حکایت سنانے کے بعد آپ نے لکھا :- میرا قصہ بھی اس میں میرے
کے قصے سے مشابہت رکھتا ہے میں تمہارے ہر ظلم کو برداشت کروں گا
لیکن نہ دربار میں حاضر ہوں گا نہ تمہارے ہاتھ پر سحیت کروں گا ۔

بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ نے بلا توقف
اپنی جائے نماز کا ندھے پر ڈالی اور اپنے مرشد شیخ برہان الدین کے مقبرے میں جا کر ان
کی قبر کی پائنتی اپنی لالھی گاڑی اور جانے مار بھا کر بیٹھ گئے اور کہا اب کوئی مرد ہو
تو مجھے اپنی جگہ سے ہلائے، بادشاہ نے شیخ کی استقامت دیکھی تو سخت شرمندہ
اور پشیمان ہوا اور اپنے ہاتھ سے یہ مصرعہ لکھ کر شیخ کی خدمت میں صدر شریف کے
ہاتھ بھیجا :-

من زان توام تو زان من باش
شیخ نے فرمایا اگر سلطان محمد شاہ غازی شریعت کے طور و طریق کی حفاظت
ترویج کی کوشش کرے اور ممالک محروسہ سے شرب خانے یک قلم اٹھا دے
اپنے باپ کی سنت پر عمل کرے اور قضاۃ، علماء اور صدور کو حکم دے کہ وہ امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر میں سعی بلیغ سے کام لیں تو فقیر زین الدین سے بڑھ کر بادشاہ کا کوئی
خیر خواہ اور دوست نہ ہوگا اور یہ اشعار اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے ۔

تا من بزیم بجز نکوئی نہ کنم جز نیک ولی و نیک خوئی نہ کنم
آہا کہ بجائے بہ بیسا کردند تا دست رسد بجز نکوئی نہ کنم
سلطان محمد تعلق جب دم توڑ رہا تھا تو جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا، کافی دیر
بحث و تمحیص ہوئی، اعیان مملکت کی مختلف آراء تھیں، بالآخر فیروز تعلق کی جانشینی
پر اتفاق ہوا، اس میں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی رائے بھی شامل تھی اور اس

فیصلے میں آپ بھی شریک تھے، جب باقاعدہ حلف برداری اور تاج پوشی کی رسم ادا کی جانی تھی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو پیغام بھیجا، تم وعدہ کرو کہ اپنے خلق سے مخلوق کے ساتھ عدل و انصاف کرو گے ورنہ ان بیکس بندگان خدا کے لیے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے، سلطان فیروز تغلق نے جواب دیا۔ میں خلق خدا کے ساتھ علم و برداری سے پیش آؤں گا اور اتفاق و محبت سے ان پر حکمرانی کروں گا۔

یہاں انصاف کی نظر چاہیے جو دیکھ اور صحیح فیصلہ دے کہ آیا صوفیا کرام آنکھوں پر پٹی باندھے اور کانوں میں تیل ڈالے، محض چلوں اور مراقبوں میں مصروف رہتے تھے یا فرمانروایان مملکت سے براہ کرم عوام کی فلاح و بہبود اور ملک میں ظلم و ستم کے استیصال کے لیے کوشاں اور فکر مند رہتے تھے؟ بادشاہ سے خلق خدا کے ساتھ علم و برداری کے سلوک کی ضمانت امور دنیا میں دلچسپی اور عامۃ المسلمین کے معاملات سے گہری رغبت کی غماز ہے یا ان سے اعراض و تسامح کی ترجمان، اور پھر یہ کہ صوفیا کرام باوجود اس کے کہ سرکار، دربار سے ہمیشہ دور رہے مگر بے خبر اور غافل نہیں رہے، انہوں نے اگرچہ سرکار کی ملازمت اور نوکری نہیں کی لیکن نگہبانی اور نگران کا فریضہ باحسن طریق سرانجام دیا اور جب محسوس کیا کہ بادشاہ وقت جاہل و عدل سے ذرا سامٹ گیا ہے یا کسی درباری اور حاکم علاقہ کی چیرہ دستیوں سے عوام نالاں ہیں تو حق کہنے اور سمجھانے میں لمحے بھر کا تامل روا نہیں رکھا، اگر سننے والے گوش نصیحت نیوش تھے تو بہتر ورنہ مشکلات اور مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا اور خندہ پیشانی سے سامنا کیا، مصائب و مظالم خواہ کتنے ہی سخت کیوں نہ تھے مگر صوفیا جو افرادوں کے آئین سے ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوئے اور آئین جو افراد کی کیا ہے؟ بس انہی دو لفظوں سے عبارت یعنی حق گوئی و بے باکی!

اسی فیروز تعلق کے ایک وزیر خان تلنگی کا واقعہ ہے جو آپ کا بے حد معتقد تھا،
 وقتاً فوقتاً اظہار عقیدت کے لیے دربار میں حاضر ہوتا رہتا اور نیاز بجالاتا، جب وزیر
 باقاعدہ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوا تو اپنے مرشد شیخ نصیر الدین دہلویؒ
 سے عبادت و ریاضت کی تفصیل دریافت کی، جواب میں ذمہ دار اور حقائق پسند
 شخصیت کے مالک پر نے تسبیح گردانی کا حکم نہیں دیا، سانس بند کر کے ذکر میں مشغولیت
 کی رائے نہیں دی، صائم الدھر اور قائم اللیل ہونے کی تلقین نہیں کی، کسی مخصوص
 وقت کسی مخصوص مجاہدے کی نصیحت نہیں فرمائی، چونکہ حق کہنے اور وعظ کرنے کا ذریعہ
 نے خود اچھا موقع ہتیا کر دیا، سو آپ نے اس سے فائدہ اٹھایا، ایک طرف وزیر کی
 جاہ و حشمت کو خاطر میں لائے بغیر لوری میا کی سے اسے کلمہ حق کہا اور دوسری جانب
 وہ کام بتایا جو تمام عبادات سے بہتر اور صوفیاء کرام کی تعلیمات کا خلاصہ اور لب لباب
 ہے یعنی خدمت خلق، آپ نے وزیر سے فرمایا: ”تم وزیر مملکت ہو، تمہاری عبادت
 یہی ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری میں انتہائی کوشش کرو، جب اس
 نے اور ادو وظائف کے لیے بے حد اصرار کیا تو آپ نے فرمایا جہاں تک ہو سکے
 باد ضرور ہو اور جو کام کرو عبادت سمجھ کر کرو۔“

سلطان شمس الدین التمش کی نیک خوئی، انصاف پروری، تقویٰ شکاری اور
 اولیاء دوستی سے زمانہ واقف ہے یہ بہ ظاہر بادشاہ باطن درویش، نرالے مزاج کا
 آدمی تھا، اچھے اوصاف اور بہترین خوبیوں کا مالک بادشاہ اولیاء اللہ کی نظروں میں
 محبوب تھا اور اسے بھی ان سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی، ملتان کے گورنر
 ناصر الدین قباچہ نے جب سلطان کے خلاف بغاوت کی تو شیخ بہاؤ الدین ذکریا
 نے خط لکھ کر سلطان شمس الدین کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا، خط راستے میں
 پکڑا گیا قباچہ سخت برا فرختہ اور بیخ پا ہوا، جب پراسس ہوئی تو نہ صرف آپ

نے خط لکھنے اور بھیجنے کا اقرار و اعتراف کیا بلکہ گورنر کو اس کی غلط روش اور فاسد ارادے سے آگاہ بھی کیا اور تنبیہ بھی جس سے مسلمانوں کو ناجائز تکلیف اٹھانے اور پریشان ہونے کے کچھ حاصل نہ ہوتا، آپ نے فرمایا۔

ہاں یہ خط میں نے لکھا ہے اور ارشاد الہی کے مطابق لکھا ہے تمہاری (غلط) کوششوں سے سوائے مسلمانوں کے خون بہنے کے اور کچھ نہ ہوگا۔ ۹

انہی شیخ بہاؤ الدین زکریا کے پوتے شاہ رکن عالم ملتان نے ایک موقع پر مسلمانوں کے خون بہانے سے بادشاہ کو روکا اور یوں لوگوں کی جانیں بچیں، واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ کشاد خان نے سلطان محمد تغلق کے خلاف بغاوت کی سلطان نے اس بغاوت کو کچل دیا اور اہل ملتان کا خون بہانے اور قاضی شہر کی کھال کھینچنے کا حکم دیا، سلطان چونکہ آپ کا بے حد معتد اور ارادتمند تھا، جب آپ کو ہتہ چلا تو آپ فوراً بادشاہ کے پاس پہنچے، اسے نصیحت کے ساتھ تنبیہ بھی کی اور اس ظالمانہ ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے روکا، سفارش کی، اور اس طرح سے اہل ملتان کی جانیں بچائیں۔

ان واقعات سے کیا اُسی صوفی کا خاکہ ابھرتا ہے جو تصوف کے مقلدین کے ہاں ملتا ہے، یعنی تحسین و پسند، رہبانیت کیش، دنیا و مافیہا سے بے خبر اور عافیت کوش قسم کے صوفی کا خاکہ، یا ایسے صوفی کا تصور ذہن میں آتا ہے جو فی الواقع تصوف کی رو سے صوفی ہے، جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال رکھنے والا خالق سے واصل ہونے کے ساتھ ساتھ مخلوق سے بھی شاعل ہے، جس کا دل تمام مسلمانوں کے ساتھ دھڑکتا ہے، جس کی زبان باطل کے خلاف شمشیر بے نیام کا درجہ رکھتی ہے جو شاہی محلوں میں آوازہ حق بلند کرنے والا اور حق کی حمیت و غیرت میں بادشاہوں

کے دامن پر ہاتھ ڈالنے والا ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی (دوم: ۱۱۵۳ھ) سلسلہ چشت کے نامور اور صاحب اثر بزرگ شمار ہوتے ہیں، آپ نے ہندوستان میں جن حالات میں کام کیا وہ بڑے ہی نازک اور کٹھن تھے، صوبوں میں خود مختاری کی لہر، مستحکم مرکزی نظام کے خاتمے، سلطنت دہلی کے زوال اور سماجی ڈھانچے کے بے جان ہونے کے باعث فضا غیر یقینی اور ماحول انتہائی دشوار اور ناسازگار تھا، آپ مثل شیخ چشت کے دستور کے مطابق سرکارِ صبار سے گریزاں اور قربِ سلطان کو آتش سوزاں جان کر علاحدہ رہے، لیکن بایں ہمہ وقتاً فوقتاً ملکی حالات کی درستگی و اصلاح کے لیے کوششیں فرماتے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے، جب تک سکندر لودھی حکمران رہا اسے برابر انصاف پروری عدل گستری، خدمتِ خلق اور رعایا کے ساتھ نیک سلوک کی تلقین کرتے رہے جب خاندان مغلیہ کا بانی سلطان ظہیر الدین بابر سرریہ آرا ہوا تو انہوں نے مغل شہنشاہ کو بھی خط لکھا اور اس میں نہایت صاف گوئی سے اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب کی نصیحت کے ساتھ ساتھ امراء، حکام و دیگر کلاں پر ازانِ مملکت کے اخلاق سدھار پر زور دیا تاکہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک پورا معاشرہ اسلامی سانچے میں داخل جائے، آپ نے اپنے مکتوب میں لکھا۔

”منعم حقیقی کے اس احسان پر اظہارِ شکر کے لیے ضروری ہے کہ پورے ملک پر عدل و انصاف کا چتر سج جائے اور کوئی شخص کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے، تمام رعایا اور فوج و سپاہ جملہ شرعی اوامر و نواہی کی پابندی کریں، نماز باجماعت ادا کریں، علم اور اہل علم سے محبت رکھیں، ہر بازار اور قصبے میں محتسب مقرر کیے جائیں تاکہ کوچہ و بازار عدل شرع محمدی کے جمال سے سنور جائیں اور اس کے نور سے روشن

منور ہو جائیں جیسا کہ اسلاف کے عہد اور خلفائے راشدین کے دور
ہمالیوں میں تھا۔

آپ نے مغل شہنشاہ کے علاوہ بعض امراء مثلاً خواص خان، ہیمیت خان، شیرانی
کو بھی اس مضمون پر مشتمل خطوط ارسال کیے اور انہیں رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور
عدل و انصاف قائم کرنے کی تلقین فرمائی، مغل اعظم جلال الدین اکبر بادشاہ ایک بار
عالم شباب میں بن سالگرہ کی تقریب پر روضہ عرفانی لباس پہن کر محل سرا سے باہر آیا
تو شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے شیخ عبدالغنیؒ نے سر دربار ٹوکا اور اس شدت
کے ساتھ ٹوکا کہ عصا کا سر بادشاہ کو جا لگا اور اکبر چپ ہو رہا۔

شیخ نور الدین مبارکؒ ۱۰۴۲ھ سلطان شمس الدین التمش کے دور میں
دہلی کے شیخ الاسلام رہے مگر پھر سے دربار میں آزادانہ تنقید کرتے رہے۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی داستان عزیمت و استقامت
سے کون آگاہ نہیں، جنہوں نے نہ صرف دربارِ شہی کی ایک غیر شرعی رسم پر تنقید کی
بلکہ عملاً اس کی مخالفت کر کے عرصے تک قلعہ گوالیار میں محبوس و نظر بند رہے سخت
پر عزیمت کو ترجیح دی، اور حق گوئی و بے باکی کی نئی اور ولولہ انگیز تاریخ مرتب کر دی،
بھی خواہوں کے مشوروں، ارباب اقتدار کی دھمکیوں، ذاتی و خاندانی مصلحتوں اور
دنیوی اور منہجی رعایتوں کو بالائے طاق رکھ کر آوازہ حق اس شدت سے بلند کیا کہ
ایوان شاہی کی بنیادیں ہل گئیں، آپ کی عزیمت و استقامت نے جہاں عہدِ جاگیر کی
کو متاثر کیا وہاں بعد میں بھی دیر تک اس کے اثرات محسوس ہوتے رہے جو بدعتیں
اور غیر شرعی رسمیں مغلیہ خاندان کے سب سے مضبوط اور طاقتور ترین حکمران کی نظر کی
میں رائج ہوئی تھیں اور جن کی پشت پر اقتدار و سلطنت کی طاقت تھی، ایک فقیر خدا
مست کی نولے حق نے ان سب پر خطِ تمغہ کھینچ دیا، جب آپ نے سلطان

نور الدین جہانگیر سے سجدہ تعظیم کے مسئلہ پر اختلاف کیا اور بادشاہ کے موروثی ہدف ستم قرار پائے تو چھوٹے موٹے افراد چھوڑ کر شہزادہ شاہ جہان تک جو آپ کا متقد اور ارادہ تھا آپ کو سمجھانے اور عتاب شاہی کی صورت میں مشکلات و مصائب بتانے میں پیش پیش تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ شیخ اس کے والد اور سلطانِ وقت کی اذیت سے محفوظ رہے، شاہ جہان نے اپنی طرف سے پوری تندرہی کے ساتھ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح شیخ مصالحت و معاہمت پر آمادہ ہو جائیں، لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک طرف اگر شہنشاہ طاقت و سلطنت کے نشے میں دھت تھا تو دوسری جانب شیخ بھی مئے حق کے نشے میں مست تھے، ادھر غرور تھا تو ادھر سرور تھا، میر اگر دستور شاہان کا پابند تھا تو فقیر بھی آئین جو انہر دان کا محافظ تھا، شہزادہ شاہ جہان نے ایک بار مقامی علماء و افضل خان اور خواجہ عبدالرحمن مفتی کو آپ کے پاس کتب فقہ دے کر روانہ کیا، تاکہ بوقت ضرورت جان کے خوف سے از رو مصلحت شریعت کی رخصت سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ کو سجدہ تعظیم کریں آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: یہ مسئلہ ضعیف حکم رخصت ہے اور مسئلہ قوی عزیمت یہ ہے کہ غیر حق کو کبھی سجدہ نہ کریں، عزیمت و استقامت کے دیگر پہلوؤں سے آگاہی کے لیے ان کا مطالعہ کریں جو آپ نے میر نعمان اپنے صاحبزادوں کے نام لکھے، مکتوبات کی جلد سوم کے دوسرے مکتوب میں تفصیل دیکھی جائے۔

انہی شیخ مجتہد کے صاحبزادے شیخ محمد معصوم سرہندی (م: ۱۰۹۶ھ) نے جو آپ کے خلیفہ مجاز بھی ہیں، اپنے قابلِ فخر والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حق گوئی و بیا کی کی تاریخ میں زریں اضافہ کیا اور ان خطوط و نقوش کو مزید واضح اور روشن کر دیا۔ جب سلطانِ وقت اورنگ زیب عالمگیر نے حضرت خواجہ محمد معصوم سے التجا کی کہ اپنا کوئی خلیفہ میری ہدایت و توجہ کے لیے روانہ فرمائیں تو آپ نے اس درخواست پر اپنے

صاحبزادے سیف الدین (م: ۱۰۹۵ھ) کو دہلی بھیج دیا، چونکہ آپ نے حق گو طبیعت اور بیباک روح اپنے جدا مجد اور والد گرامی سے میراث میں پائی، چنانچہ اس کا مظاہرہ قدم قدم پر ہوا، دہلی پہنچتے ہی آپ نے پوری شدت سے اصلاح احوال و تعمیر اخلاق کا کام شروع کر دیا، اب آپ دہلی پہنچے ہی تھے کہ پہلے قدم پر آپ کی حق گوئی کا امتحان ہوا، جس سے آپ سرخرو ہو کر نکلے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ اللہ کے شیریں کو کبھی رو باہی آہی نہیں سکتی، ہوا یوں کہ جب آپ نے دہلی میں قدم رکھا تو سلطان نے بنفس نفیس کا استقبال کیا اور بڑے اعزاز و اکرام سے آپ کو شہر میں لایا اور قلعہ میں لے گیا، جو نہی آپ نے قلعہ کا دروازہ عبور کیا، دو ہاتھیوں کی موڑیں دیکھیں، جن پر فیلبان سوار تھے، بادشاہ کو مخاطب کر کے فرمایا، میں قلعہ میں نت داخل ہوں گا کہ یہ موڑیں توڑ دی جائیں، چنانچہ وہ ہاتھی اور فیلبان توڑ دیے گئے پھر آپ قلعہ میں داخل ہوئے، دوسرے روز آپ نے ارشاد فرمایا تمام گوتوں گائوں بے ریش رقاص لڑکوں اور تمام اہل بدعت کو سندوستان کے محروسہ سے نکال دیا جائے، بادشاہ نے اس ارشاد کی بھی تعمیل کی، ایک روز بادشاہ نے حضرت شیخ کو حیات بخش باغ کی سیر کرنے کی تکلیف دی، وہ سونے کی مچھلیاں تھیں جن کی آنکھوں میں جواہرات ٹنگے ہوئے تھے، حضرت شیخؒ نے یہ دیکھ کر فرمایا، جب تک یہ مچھلیاں توڑ نہ دی جائیں میں اس جگہ نہ بیٹھوں گا، باغ کے محافظوں نے نقصان شاہی کے خیال سے ان کے توڑنے میں تامل کیا، لیکن بادشاہ نے فوراً اڑوا دیں اور کہا کہ ارشاد شیخؒ کی تعمیل میں زیادہ نفع ہے..... بادشاہ اس امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کے قیام سے بہت خوش ہوا، چنانچہ بادشاہ نے خواجہ محمد معصومؒ کی خدمت میں شکر گزاری کا عریضہ لکھا۔

یہ ہیں وہ حقائق جنہیں پیش نظر رکھ کر اپنے ذہن کو تصوف وار باب تصوف

کے بارے میں پیدا شدہ یا پیدا کردہ غلط فہمیوں سے صاف کیا جاسکتا ہے، اگر نیک
 نیتی کے ساتھ دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ تقصوت تعطل و جمود، عافیت کوشی اور
 سہل انگاری کا نام نہیں بلکہ تقصوت ایک علمی، اخلاقی، روحانی اور معاشرتی تحریک
 ہے جس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہے، تقصوت نے جو ذہن اور اقدار تیار
 کیے ہیں وہ بیک وقت عبادت گزار اور تقویٰ شعار بھی ہیں اور علم و اخلاق کے علمبردار
 بھی، ان کے اندر علمی گہرائی بھی پائی جاتی ہے اور روحانی عظمت بھی، خدمت خلق ان
 کا شیوہ ہے تو معاشرتی اصلاح ان کا دتیرہ، اگر وہ معیت و قرب خداوندی کی طلب
 میں سرشار ہیں تو دوسری جانب ان کے دل خلق خدا کی محبت و ہمدردی سے لبریز
 بھی ہیں، ایشار ان کا نصب العین ہے اور مروت ان کی متاع حیات، جہاں وہ
 صدق و صفا کے پیکر ہیں وہاں وہ بذل و عطا کے مجسمے بھی ہیں، دم گفت گو نرم نظر
 آتے ہیں مگر دم جستجو گرم بلکہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں، حلقہ یاراں میں ابریشم اور رزم حق و
 باطل میں مانند فولاد ہیں، ایک طرف وہ تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک ہیں اور دوسری
 جانب استیصال باطل کے لیے مصروف عمل، غرضیکہ ایک ایک فرد بجائے خود انجمن
 اپنی ذات میں تحریک اور انسانی پیکر میں ایک انقلاب ہے، رات کو ان کی آنکھیں
 خشیت خداوندی سے اشکبار ہوتی ہیں اور دن کو ظالم و جابر کی آنکھوں سے ملائی
 جاتی ہیں، نماز میں تفرغ اور زاری سے جھکی گردنیں دربار میں اکرامی رہتی ہیں، شکستہ
 مسجد کے خستہ حال موذن کی تکبیر پر دوڑ پڑنے والے، یہ فقیر بادشاہوں کے ہزار
 بلاوے پر بھی اوصح کار رخ نہیں کرتے، خدا کے حضور کانپنے اور لرزنے والے یہ انسان
 ایوان شاہی میں پہاڑوں کی سی مضبوطی کے ساتھ بات کرتے ہیں، مزدور بن کر بیواؤں
 ضعیفوں اور مسافروں کا بوجھ اٹھانے والے، وقت کے بادشاہوں کی اطاعت
 کے حلقے کا بار گردن پر نہیں سہہ سکتے، یہ زندگان مولا صفات اور قدسی عادات،

یہ پاکباز و پاک نفس اپنی زندگی اس شان سے بسر کرتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی خدا کی بندگی شمار ہوتی ہے، کیونکہ ان کا ہر قدم رضائے خدا تعالیٰ کی طلب میں اٹھتا ہے، اور ان کے ہر عمل کا مقصد خدا کی خوشنودی ہے، ان کی نماز، ان کی قربانی ان کی زندگی اور ان کی موت سب "رب العالمین" کے لیے ہوتی ہے، حق و صداقت کے پیچھے جس راہ سے گزرے ان کے قدموں کی مٹی کا ہر ذرہ جاوہ پیاؤں کے لیے مشعل راہ اور منزل کے لیے سنگ میل ہوتا گیا اور ان کے ذرات راہ دعوت و عزیمت کی تاریخ کا مستقل عنوان بننے لگے جو قابل فخر بھی ہیں اور آنے والوں کے لیے قابل تقلید بھی۔

”قصرِ عبور“

جدید علم نفسیات میں عمل کے دو محرکات تسلیم کیے گئے ہیں ترغیب (TEMPTATION) اور ترمیب (PERSECUTION) اور عمل کے سلسلہ میں یہی دو مانعات بھی ہیں، یعنی اگر کسی کو کسی کام سے روکنا مقصود ہے تو دو ہی حربے استعمال کیے جاسکتے ہیں یا لالچ دے کر خرید لیا جائے یا دھمکا کر خاموش کرادیا جائے، مگر جن لوگوں کے مذہب و مسلک کی بنیاد ”امانت داری“ اور اخلاص پر جو ان پر دونوں کا کچھ اثر نہیں پڑتا، ترغیب کی صورت میں وہ تاج سکندری پر طیر بھی نگاہ ڈالتا بھی پسند نہیں کرتے اور ترمیب کے ضمن میں ان کا عقیدہ یہ ہے :-

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں

اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ان کا ضمیر اور ان کی جان دونوں خدا کی امانت ہیں۔ بھاری سے بھاری قیمت کے عوض ضمیر بیچنا ان کے منشور زندگی میں نہیں کہ امانت ناقابلِ بیع و شرا ہوتی ہے جان کا خوف انہیں دامن کشش نہیں ہوتا کہ وہ ع

جان دی ادی ہوئی اسی کی بختی

کے مسلک کے علمبردار ہیں اس لیے ترغیب و ترمیب دو ایسے ہتھیار ہیں جو ان پر کبھی کارگر ثابت نہیں ہوئے۔

”آئین جوانمرداں حق گوئی و مہربانی“ کے عنوان کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ صوفیاء کرام نے نہ صرف خانقاہوں میں بیٹھ کر اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفس کی کوششیں کیں بلکہ تربیب کے تمام تر فلسفے کے علی الرغم بادشاہوں، امیروں، تاجداروں اور کلاہ پوشوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، بادشاہوں کے ایوانوں، امرا کے درباروں تاجداروں کی تخت و تندی اور کلاہ پوشوں کی جاہ و شمت کا صرف یہ ہی نہیں کہ صوفیاء نے اثر قبول نہیں کیا بلکہ اسے سراسر ناپاک کا کھیل سمجھا۔

ہر وہ تحریک جو رضا کارانہ بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو اس کی بنیاد میں اگر امانت و اخلاص موجود نہیں تو وہ کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی، دین کہ جس کا سارا دل و مدارق قلب روح کی آمادگی پر ہے اس کے لیے یہ دونوں شرطیں بہ طریق اولیٰ لازم ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی روحانی و اخلاقی فلاح کے لیے اور مسائل زندگی کی اصلاح کے لیے خداوند عالم کی جانب سے ایک لاکھ سے زیادہ نفوسِ قدسی الہامِ وحی سے سرفراز ہوئے اور منصب نبوت پر فائز ہو کر لوگوں کو بھولی ہوئی بات اور فراموش کردہ عہد یاد دلایا، لیکن اس کے طریق کار کے سلسلہ میں مختلف امتوں اور مختلف زمانوں کے انبیاء کے درمیان جو قدر مشترک ہمیشہ موجود رہی وہ یہی امانت و اخلاص کی قدر تھی اس وقت امانت کا ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں اس لیے اب دوسرا جزو ہم اپنے جائزے کے لیے مختص کرتے ہیں، ہر آنے والے بشر و مندر پر مبعوث ہونے والے نبی اور منصب رسالت پر فائز ہونے والی ذاتِ گرامی نے آتے ہی قوم کے سامنے اپنی بے غرضی، بے نفسی اور اخلاص کا یقین دلایا گویا وہ یہ جانتے تھے کہ جو پودا ہم لگانا چاہتے ہیں وہ بے غرضی اور اخلاص کے پانی کے بغیر کبھی نہیں اگ سکتا، اس لیے اس بات کا بار بار یقین دلایا اور لوگوں کے ذہنوں میں اسی بات کو راسخ کرنے کی برہ کوشش فرمائی، سورہ شعراء کی متعدد آیات ملاحظہ کیجئے۔

”قوم فوج نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا جب اُن سے اُن کے بھائی نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں تو خدا سے ڈرو، میرا کھانا لو اور اس کام کا تم سے کچھ صلہ نہیں مانگتا میرا صلہ تو رب العالمین پر ہی ہے۔“

جناب ہود علیہ السلام نے فرمایا:-

”عاد نے بھی رسولوں کو جھٹلایا جب اُن سے اُن کے بھائی ہود نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور میں اس خدمت کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو جہانوں کے پروردگار کے پاس ہے۔“

جناب صالح علیہ السلام قوم سے مخاطب ہیں:-

”قوم ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا جب اُن سے اُن کے بھائی صالح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں تو خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور اس خدمت کا معاوضہ تم سے نہیں چاہتا میرا معاوضہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔“

حضرت لوط علیہ السلام اپنی حیثیت اور رسالت کی عرض و غایت واضح کرتے ہوئے گویا ہیں:-

”قوم لوط نے رسولوں کی تکذیب کی جب اُن سے اُن کے بھائی لوط نے کہا تم تقویٰ کیوں نہیں اختیار کرتے میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں، تو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کھانا لو اور میں تم سے اپنے اس کام کا کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا اجر جہانوں کے پالنے والے کے پاس ہے۔“

حضرت شعیب علیہ السلام بھی دوسرے انبیاء کرام سے ہم آہنگ اور اُن

کے ہمنوا ہیں اور فرماتے ہیں :-

”میں تم سے اس کام کا کوئی بدلہ نہیں چاہتا، میرا اجر تو جہانوں کے پالنے والے پر ہے۔“

قرآن مجید میں ایک ایسا فرستادہ کا ذکر ملتا ہے جو شہر کے کنارے سے آیا تھا، اس نے جو بات جس در و اور سوز میں ڈوب کر کہی اور جس غلام اور اپنائیت سے کہی، ایک طرف وہ اس کے جذبہ اطاعت حق کی غماز تھی اور دوسری جانب مقام رسالت و منصب نبوت کو واضح کرنے کے لیے دلیل قاطع اور بہان ساطع تھی اس نے کہا :-

”اے قوم رسولوں کی اتباع کرو، ان کی اتباع کرو جو تم سے کوئی معاوضہ

نہیں چاہتے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔“

اس نے بیک وقت دو باتیں کہیں کہ رسول کی صداقت کی دو ہی دلیلیں ہو سکتی ہیں، اس کے قول و فعل میں ہم آہنگی اور صلہ سے بے نیازی اور یہ دونوں چیزیں انبیاء کرام کی سیرتوں کا طرہ امتیاز ہیں، اس نے اپنے کلام میں یہ کہہ کر زور پیدا کر دیا کہ اتباع تو کرنی بھی اس کی چاہیے جو داد و ستد سے بے پروا، حصول منفعت اور جلبِ نر سے گریزاں اور لالچ اور غرض سے پاک ہو۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس عقیدے کا اظہار بار بار فرمایا ہے۔

”آپ کہہ دیجئے میں تم سے اس خدمت کے لیے کسی معاوضے کا طلبگار نہیں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار اپنے خطبوں میں لوگوں پر یہ امر واضح کیا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں کسی صلہ کی تمنا، مزد و معاوضے کی خواہش اور داد و دہش کی آرزو کے بغیر کر رہا ہوں، بلکہ آپ نے زندگی بھر اس امر کا اہتمام کیا کہ کسی سے کوئی چیز اس طرح نہ لی جائے چاہے وہ عاریتہ ہو یا قرضِ حسنہ کے طور پر، جس میں اجر و معاوضہ

کا کوئی شائبہ تک موجود ہو۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نفسی اور بے غرضی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اولاً آپ نے کوئی میراث نہیں چھوڑی، ثانیاً اگر کوئی اقل قلیل چھوڑی بھی ہے تو کسی کو اپنا وارث نہیں بھڑایا اور ثالثاً تمام صدقات واجبہ کو اپنی اولاد پر حرام قرار دے دیا، ادنیٰ اسے ادنیٰ شائبہ بھی اگر پیدا ہونے کا امکان تھا تو اس کی راہ بھی مسدود کر دی بخیری کی ایک روایت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :-

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے عالم میں وفات پائی کہ آپ کی رزق میں صاع جو کے بدلے ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔ یہودی سے قرض لینے کی مسلماتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شارحین حدیث اور علماء نے مختلف آراء پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ :-

”آپ اس کے شبہ اور شائبہ سے بھی بچنا چاہتے تھے کہ آپ کے ذریعہ اہل ایمان کو دین کی جو دولت ملی، اس کے عوض آپ کوئی حقیر سے حقیر بھی دنیوی فائدہ ان سے اٹھائیں اس لیے ضرورت کے موقع پر آپ قرض بھی غیر مسلموں سے لینا چاہتے تھے۔“

اسی اخلاص و امانت کو تصوف کے حلقوں میں فقر غنیور کہا جاتا ہے جو ہمارا عنوان بحث ہے، صوفیاء کرام نے جن کھٹن حالات، ناسازگار ماحول اور مخالفت فضا میں تبلیغ و اشاعت کا مشکل ترین اور صبر آزما فریضہ سرانجام دیا اس کا جائزہ ایک مستقل عنوان کے تحت لیا گیا ہے، لیکن اس سب کے باوجود صوفیاء کا دامن لالچ اور حرص سے پاک ہے، قدموں میں عمامے ڈالے گئے، ہاتھوں میں جاگیروں کے قبائے دیے گئے، مراعات و وظائف کے پروانے پیش کیے گئے، آزمائش و امتحان

کے طور پر زرد جو اہر ڈھیر کیے گئے شاید آنکھیں ان کی چکا چوند سے خیرہ ہو جائیں قبول منصب کی صورت میں حاصل ہونے والے فوائد اور انکار کے نتیجے میں پیش آنے والے مصائب و شدائد گنوائے گئے، بیک وقت دو متضاد کیفیتوں سے دوچار کر کے انعام اکرام قبول کرانے کی کوششیں کی گئیں، قسری عزیزیوں اور عزیز دوستوں کو درمیان میں لاکر قفس زر میں ان "طائرانِ لاہوتی" کو بند کرنے کے جتن کیے گئے، مگر ان کی روح کی آزادی، دل کے غنا و وفقر کی غیرت انہیں کسی چیز کی طرف آمادہ و مائل نہ کر سکی انہوں نے پھونس کے جھونپڑے کو الیوان شاہی، ٹاٹ کی ٹوپی کو کلاہ خسروی، کھدکی پوتین کو قبائے سلطانی، جو کے ان چھنے آٹے کی روٹی کو مرغ و ماہی کی قابلوں، فرش خاک کو سجاد و سمور کے بستروں اور بوریا نشینی کو صند نشینی کے عوض نہ بیچ کر غیرت فقر کی لاج رکھی اور یہی ان کی کل کائنات تھی، صوفیاء کرام کو ہمیشہ یہ متفرد اعزاز حاصل رہا ہے کہ انہوں نے دنیا کو پاؤں کی ٹھوکر اور بند گان دنیا کو جوتے کی نوک پر رکھا ان کا مٹی کا لوٹا بوسیدہ چاٹی، ٹوٹی قیسع اور پھٹی ٹوپی شاہوں کے تخت و تاج سے زیادہ قیمتی تھی، جنہیں فرش خاک پر اور فقیروں کے درمیان بیٹھنے کا لطف میسر آیا، انہیں مسند امارت پر اور خدام و حشم کے جلو میں بیٹھنا کیسے راس آسکتا تھا، اس لیے جب سلطان بھرنے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو نیم روز کی گور زری پیش کی تو آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

صوفیاء کرام جہاں بھی گئے فقر و استغناء کی مثالیں قائم کر آئے، جو خدمت سرانجام دی بلا مزد و معاوضہ سرانجام دی، تبلیغ کو پیشہ نہیں بلکہ فریضہ سمجھ کر ادا کیا، لوگوں کو ایمان و ایقان کی لازوال دولت سے نوازنے کے باوجود ان کی دولت میں خود کو کبھی حصہ دار نہ جانا، بادشاہ ان کے جھونپڑوں کا طواف کرتے رہے مگر انہوں نے کبھی شاہ کے در دولت پر دستک دے کر غیرت فقر کو مخرج نہیں کیا یہی وجہ

ہے کہ دنیا پرست علماء و جواد شاہوں کے گرد شہد کی مکھوں کی طرح بٹھکتے تھے اور ان کے اشارہ ابرو پر ضمیر و ایمان کے سودے چکاتے تھے، باوجود منصب سبب اور سرکاری تحفظ و مراعات کے لوگوں کے دلوں میں وہ مقام پیدا نہ کر سکے جو ان بے نواؤں کو حاصل ہے اور آج تجربہ شاہد ہے کہ لوگ فوراً اس سے بدظن ہوتے ہیں جو امراء کے ارد گرد منڈلاتا ہو اور وہ شخص دنیا کے دل کے تخت پر ٹھکن ہو جاتا ہے ہے جس نے اپنا پیوند کسی کے پاس گرومی نہ رکھا ہو۔

بادشاہوں نے اپنی سی کوشش کر ڈالی، امراء کی التجاؤں سے ٹکمی بندھ گئی سرمایہ دار خاک چاٹتے رہے، جاگیردار پیشانیاں رگڑتے رہے، نواب در پر پڑے رہے، رئیس کہہ کہہ کر عاجز آ گئے، ہمارا جوں کے ناو خشک ہو گئے، کسی نے نذر دینی چاہی کسی نے ہدیہ پیش کرنا چاہا، کسی نے جاگیر بخشی چاہی، کسی نے منصب سنبھالنا چاہا کسی نے وظیفہ جاری کرنا چاہا، مگر کسی ایک کی بھی پیش نہ گئی اور یوں صوفیاء کرام نے غیرت و فقر کے فانوس کو بجھنے نہ دیا،

شیخ نور ترک اعلیٰ پایہ کے بزرگ گزرے ہیں، بابا فرید الدین گنج شکرؒ خواجہ نظام الدین اولیاؒ، خواجہ میر خورڈ، اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے آپ کا ذکر بڑے احرام اور شاندار الفاظ میں کیا ہے، آپ رضیہ سلطانہ دہمہ حکومت ۹۳۴ تا ۹۳۷ء کے عہد میں ہو گئے۔ میں بڑی سبب نیاز اور غیور طبیعت پائی تھی، کسی سے طمع اور کسی سے تمنا آپ کی سرشت میں نہ تھی، نہ دولت کے لیے ہاتھ پھیلائے اور نہ آنکھ اٹھا کر دیکھا، خواجہ نظام الدین اولیاؒ دہلویؒ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: ایک بار رضیہ سلطانہ نے زر نقد بھیجا، یہ اچھی غلطی رقم تھی، آپ نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت ایک چھری تھی انہوں نے اس چھری کو زر نقد پر مارا اور فرمایا یہ کیا ہے؟ اسے میرے سامنے سے لے جاؤ۔ علیہ

اسی رضیہ سلطانہ کے والد سلطان شمس الدین التمش کے دور کا واقعہ ہے یہ بادشاہ ایک فقیر فش، نیکو کار اور تقویٰ شعار بادشاہ تھا، بزرگوں سے بے حد عقیدت و محبت رکھنے اور ان سے خندہ پیشانی سے پیش آنے والا تھا، ذاتی طور پر بے حد شریف اور متقی انسان تھا، خواجہ قطب الدین بختیار کالی سمیت معاصر بزرگوں اور صوفیوں سے اس کے نیاز مندانہ اور عقیدت کیشا نہ تعلقات تھے، لیکن تاریخ شاید ہے کہ کسی صوفی اور بزرگ کے لیے شاہ کی دوستی کبھی مسئلہ نہ بنی، ملنے بلانے کی مدت بزرگوں نے اخلاص مگر لینے لوآنے کے معاملہ میں استغناء کا ثبوت پیش کیا، حالانکہ سلطان نے جو کچھ پیش کیا، لالچ کے طور پر نہیں ازراہ عقیدت پیش کیا مگر "فخر غیور" اسے بھی برداشت نہ کر سکا۔ شیخ حامد بن فضل اللہ شمالی رقمطراز ہیں :-

"ایک بار سلطان شمس الدین التمش نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کالی کو دہلی کی "شیخ الاسلامی" کا منصب پیش کیا تو آپ نے اس پیشکش کی جانب مطلق توجہ نہ کی۔"

اس دور میں شیخ الاسلامی کا منصب مذہبی اور سیاسی نقطہ نظر سے کوئی معمولی منصب نہ تھا، تفصیل کا موقع نہیں دینا بتایا جاتا کہ اس منصب کے لیے کتنے عبادار اور عمامہ پوش "بے چین اور سرگردان تھے اور جس کے دل کے کسی بھی گوشے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا جائے تو کہیں ذرا سی بے چینی نظر نہیں آتی، عمدہ اسے دیا جا رہا ہے مگر اسے "شیخ الاسلام" سے نہیں "اسلام" سے غرض تھی، اس کی تو خواہش تھی کہ زندگی اگر "خادم اسلام" کی حیثیت سے گزار جاؤں تو رہے نصیب، "شیخ الاسلام" ہونا تو بڑی بھاری ذمہ داری ہے، اسے محض "نمبر داری" نہیں بلکہ "ذمہ داری" کا احساس تھا۔

عام لوگ جب صاحب منصب و جاہ بن جاتے ہیں تو ان کی گردنیں فخر سے تن جاتی ہیں، کسی کو جاگیر مل جائے تو اس کا قدم زمین پر نہیں پڑتا، کسی کو زمین کا قطعہ حاصل

ہو جائے تو اس کے سر میں عجب غرور آجاتا ہے، مگر غرور غیور جن کا سرمایہ حیات ہودہ ان چیزوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؛ ملاحظہ فرمائیے، خواجہ حسن دہلوی، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی ایک مجلس منعقدہ ۱۹ جمادی الاول ۱۳۳۷ھ کی رویداد قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”سعادت قدم بوسی میر آئی، انہی دلوں کسی رئیس نے دو باغیوں کے
 اصرار سبب و آلات سمیت بہت سی زمین کی ملکیت کے کاغذات آپ
 کی خدمت میں بھجوائے تھے اور آپ کے ساتھ اپنے اخلاص کا اظہار
 کیا تھا، حضرت خواجہؒ نے قبول نہ کیا، حضرت اس باب میں فرما رہے تھے
 کیا میں باغ، کھیتی اور زمین والا چوہدری بن جاؤں، آپ تبسم فرما رہے
 تھے اور کہہ رہے تھے میں یہ قبول کر لوں تو لوگ کیا کہیں گے، یہی کہ
 شیخ باغ کو جارہا ہے، شیخ کھیتوں اور اراضی کے معائنہ کے لیے
 جارہا ہے، یہ میرا عجیب و غریب فعل ہوگا، اس کا کوئی عمل ہے؛ یہ
 کہتے کہتے آپ ابدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے، ہمارے خواجگان
 اور ہمارے مشائخ میں سے کسی نے بھی اس طرح کا کام نہیں کیا۔“

کسی نے سچ کہا ہے:-

”جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
 ہم چند سطور قبل خواجہ بختیار کاکیؒ کے ضمن میں لکھ آئے ہیں کہ انہوں نے شیخ الاسلامؒ
 کے منصب کو لائق اعتناء نہ سمجھا، شیخ کاکیؒ کے مرید و خلیفہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ میں اور ان
 کے مرید و خلیفہ خواجہ نظام الدین دہلویؒ میں شیخ الشیوخ کی سیرت کا پرتو خواجہ نظام الدین
 دہلویؒ کے آئینہ میں درکھئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے جو خواجہ نظام الدین دہلوی
 کے عقیدتمندوں اور ارادت کیشوں میں سے تھا، آپ سے ”شاہی امامت“ قبول کرنے

کی درخواست کی تو فرمایا: ہمارے پاس سوائے نماز کے اور کیا ہے؟ بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی جاتی رہے۔

غنا مال و اسباب سے حاصل نہیں ہوتا، اس کا مقام دل ہے، غنا کا تعلق شکم سیری سے نہیں چشم سیری سے ہے، جس کی آنکھ سیر اور دل غنی نہیں اس کا پیٹ صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے لیکن جسے "مقام غنا" حاصل ہے وہ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود مٹھی میں دونوں جہان کے خزانے رکھتا ہے، غنا کمیت کا نام نہیں، کیفیت کا نام ہے، اس کیفیت کے پیدا کرنے میں روح اور قلب کی آزادی کا خاصہ حصہ ہوتا ہے، دل کی آزادی ہی تو شہنشاہی ہوتی ہے، جو چیز مردانِ احرار کو حاصل ہے وہ "شاہانِ تاجدار" کے نصیبوں میں کہاں؟ چٹائی پر بیٹھ کر سردہ نشینی، کالطف مردانِ احرار کی قسمت میں ہوتا ہے، ایسے ہی راہ نشین اور غنی دل رکھنے والے فقیر کا ایک ہاتھ ہے جسے میر خور و نے سیر الاولیاء میں نقل کیا ہے اور ہم اسے "مارغ" مثلاً چشت کے حوالے سے لکھ رہے ہیں۔

"ایک بار والی ناگور نے شیخ حمید الدین ناگوری کو شاہ وقت کی جانب سے کچھ زمین اور نقد و پیسہ پیش کیا اور قبول کرنے کی درخواست کی، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ہمارے خواجگان میں سے کسی نے ایسی چیز قبول نہیں کی، ایک دیگر زمین جو میرے پاس ہے، میرے لیے کافی ہے۔"

اوزنگندی عالمگیر کا ایک بیٹا صوفیاء اور اولیاء سے عقیدت رکھنے والا تھا اور اُسے برابر کسی بزرگ اور صوفی کی تلاش رہی تاکہ زیارت سے فیض یاب ہو سکے، عالمگیر کو اس کی ان سرگرمیوں کا پورا علم تھا چنانچہ اس نے ایک مفصل خط میں بیٹے کو لکھا کہ ہر ماہ اس قابل نہیں کہ اُسے پکڑ لیا جائے اور ہر ماہ اس لائق نہیں کہ اُسے تھام لیا جائے

بڑے بڑے و عویدار اکثر و بیشتر بہت چھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ غلطی اس معاملہ میں احتیاط و حزم اختیار کرو اور آخر میں ایک ایسے بزرگ کا واقعہ لکھا جو فقر و استغناء کا بیکر تھا جس کا اثر شہنشاہ نے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا، اور نگ زیب لکھتا ہے:-
 میں نے ایک بار شیخ عبداللطیف برہان پوری کو گاؤں قبول کرنے کی درخواست کی تو فرمایا:-

سے شاہ مارا وہ وہ منت نہد رازق مار ذق بے منت وہد
 بادشاہ ہمیں گاؤں دیتا ہے اور احسان دھرتا ہے، ہمارا رازق ہمیں بغیر منت جیسے رزق دیتا ہے:-

شیخؒ نے بڑی لطافت اور خوبی سے اپنی بے نیازی کا اظہار بھی کر دیا اور مصنوعی اور حقیقی خداؤں میں فرق بھی واضح کر دیا، دل کی بات زبان پر لانے اور حسن تدبیر سے بات سمجھانے کا ڈھنگ کوئی ان سے سیکھے۔

حضرت مرزا جانجاناںؒ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک امیر نے ایک حویلی اور خانقاہ تیار کر کے اور فقراء کی وجہ معاش مقرر کر کے آپ کی خدمت میں عرض کیا اور قبولیت کی درخواست پیش کی آپ نے ان مراعات کو قبول نہ فرمایا اور جواب دیا:-
 ”چھوڑ جانے کے لیے اپنا اور بیگانہ مکان برابر ہیں، فقیروں کا خزانہ صبر و قناعت ہے۔“

انہی کے متعلق ایک اور ایمان افروز اور حقیقت کشا واقعہ ہے کہ ایک دن سخت جاڑے میں آپ ایک پرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے، نواب خان فیروز جنگ دربار میں حاضر تھا۔ یہ حال دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس نے اپنے ایک معاحب سے کہا کہ ہم گنہگاروں کی کیسی بد قسمتی ہے کہ وہ بزرگ جن کی خدمت میں ہمیں ارادت ہے ہماری نیاز قبول نہیں کرتے، آپ نے فرمایا:-

فقیر نے روزہ رکھا ہوا ہے کہ امیروں کی نیاز قبول نہ کروں گا اب جبکہ
آفتاب مغرب ہونے کے قریب پہنچ گیا ہے، میں اپنا روزہ
کیوں توڑوں؟

آپ کی سیر و سوانح پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ واقعی آپ نے کبھی اپنا روزہ نہیں
توڑا اور زندگی بھر اپنے عہد پر قائم رہے۔

مرزا جانجانا کے عقیدتمندوں میں عیاں کہ آپ پڑا چکے ہیں اچھے خاصے رئیس
اور متمول آدمی تھے، مگر ان کی ہر مالی پیش کش آپ کی غیرت فقر کی تذر ہو گئی، آپ کی
اس ظاہری تنگ دستی کو دیکھ کر ایک بار نواب نظام الملک نے بھی کچھ پیش کرنے کی جرات
کی تھی مگر اس کی درخواست کو درخود اعتدال نہ سمجھا گیا، آپ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ:-

”ایک بار نواب نظام الملک نے تیس ہزار روپیہ بطور نیاز پیش کیا آپ نے

حسب عادت قبول نہ فرمایا تو نواب نے عرض کیا آپ انہیں لے کر راہ

خدا میں فقیروں کو بانٹ دیں، آپ جلال میں آگئے فرمایا میں تمہارا خاناں

ہوں! یہاں سے تقسیم کرنا شروع کر دو مگر پہنچے تک ختم ہو جائیں گے۔“

اہل زچہ و نیکی کی مانند اپنا رزق زمین میں تلاش کرتے ہیں اور یوں رینگنے والے فقیر

کیڑے بن کر رہ جاتے ہیں مگر اہل فقر عقاب کی مانند فوسر کو نگاہ میں نہیں لاتے بلکہ

ان کی نگاہ تو فضاؤں سے بھی دور ہوتی ہے، وہ خود کو اللہ کا عیال سمجھ کر رزق کا

ذمہ اللہ کو سونپ دیتے ہیں جب وہ رزق میں اس خدا کو اپنا کفیل بنا لیتے ہیں جو کبھی

نہ ہاتھ سکڑاتا ہے نہ اس کا خزانہ خالی ہوتا ہے اور نہ ہی کبھی بھولتا ہے تو پھر ان کی نظر

میں شاہوں اور راجاؤں اور رئیسوں کی حیثیت ملو مور سے زیادہ نہیں رہتی نہ تو رزق

برق لباس ان کی آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں، زریں طشت ان کا دل ہلاتے ہیں اور نہ

کھینکتے ان کے دل کی دھڑکن تیز کرتے ہیں، بلکہ ان کی بے نیازی میں ایک اور

شان پیدا ہو جاتی ہے۔ شاہ توکل انبالویؒ کے بارے میں پروفیسر نور بخش توکلی لکھتے ہیں:-

”ایک بار مہاراجہ جتوں نے پشت میں نذر رکھ کر پیش کی، فرمایا یہ کیا ہے عرض کیا پالتو بیگہ زمین کے کاغذات ملکیت، ایک نوٹ اور کچھ اشرافیاں میں فرمایا میں زمین سے کر کیا کروں گا یہ تو فساد کی جڑ ہے، ان روپوں کی بھی مجھے ضرورت نہیں اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا ”دیکھ وہ ہمدانگر ہے، وہاں سے سو پیر میرا لہ اناج چلا آ رہا ہے“

حضرت شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ اس دور کے باخدا اور نہایت ہی روحانی بزرگ گذرے ہیں، آپ کا حلقہ ارادت دور دور تک پھیلا ہوا تھا، باوجود اس کے کہ آپ متاخرین میں سے ہیں مگر جو اخلاص، اور، سوز، فقر، تقویٰ، پارسائی اور استغناء آپ کے ہاں ملتا ہے اس سے آپ متقدمین میں ایک نمایاں فرد نظر آتے ہیں، مادہ پرستی کے اس دور میں یہ روحانی وجود عطیۃ الہی سے کم نہیں، آپ بیک وقت سربراہائے علم و فضل اور زرب سجادہ تقویٰ ولایت تھے، آپ کی سوانح میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں جو آپ کے فقر غیور کی نشاندہی کرتے ہیں، آپ کے ہاں آنے والوں میں عامی و عالم، رعایا و حاکم اور چھوٹے بڑے ہر طبقہ زندگی کے لوگ شامل تھے بلکہ آپ کے اراد مند مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور انگریز بھی تھے اور وقتاً فوقتاً حاضری دیا کرتے تھے، یورپی اور ادوہ کے انگریز یعیٹسٹ گورنر نے متعدد بار آپ کی زیارت کی، اس سب کے باوجود وہی سامان گدایانہ اور انداز شامانہ برقرار رہا آپ کے سوانح نگار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:-

”ایک مرتبہ الہ آباد سے ہائی کورٹ کا ایک انگریز جج اس تحقیق کے لیے آیا تھا کہ آپ کے پاس ہر ملک کے لوگوں کا جمع کیوں رہتا ہے؟

کیونکہ اس زمانہ میں حیدر آباد سے نواب خورشید جاہ آپ کے پاس آئے تھے، آپ نے فرمایا توبہ کے لیے آئیں، ہم ان کے گواہ ہو جاتے ہیں تم بھی شرک سے توبہ کرو ہم گواہ ہو جائیں گے۔ انگریز اس صاف گوئی پر بڑا خوش ہوا اور کہا آپ کی خانقاہ کے لیے اگر فرمائیں تو ملکہ معظمہ کو لکھوں، فرمایا کیا ضرورت ہے، ہمارے پاس خدا کے فضل سے دو جوڑے کپڑے، دو لوٹے مٹی کے اور دو گھڑے موجود ہیں۔

صوفیاء کرام کا کہنا ہے کہ کوئی شخص اس وقت فقیر نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی نظر میں سونے کی ٹلی اور مٹی کا ڈھیلہ برابر نہ ہو جائے، بعینہ یہی بات ہیں صوفیاء کے کردار میں نظر آتی ہے کہ چمکتے کھنکے سکے ان کی نظر میں ٹھیکریوں اور گھونگوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے، مال و دولت کا ذکر سن کر صوفیاء کسی پہلو بد لئے پر عبور نہیں ہوئے جس سے ان کی بے تابی کا احساس ہو، اپنی شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے بارے میں مذکور ہے، مولانا محب اللہ لہر دہوی فرماتے ہیں :-

ہم نے شاہ فضل رحمن کی خدمت میں عرض کیا، کبھی رامپور تشریف لے چلے نواب کلب علی خان (دالی رامپور) آپ کے دیدار کے بڑے مشتاق ہیں آپ کے تشریف لے جانے کی صورت میں، ایک لاکھ روپیہ نذر کریں گے، آپ جس طرح سے بات کر رہے تھے اسی طرح کرتے رہے اور اس پیش کش کو معمولی بات کی طرح ٹال دیا، اور فرمایا کہ میاں لاکھ روپے پر خاک ڈالو اور بات سنو،

جو ہم دل پہ اسکا کرم دیکھتے ہیں تو دل کو بہ از جام جم دیکھتے ہیں اور پھر وہی سوز و عشق کی کہانی کرتے رہے۔

سچ ہے خدا کے در پر دامن پھیلائے خدا لے دو عالم سے بے نیاز ہو جاتے ہیں

اور اس کی گلی میں بستر لگانے والے پھیری لگانے سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔
 حضرت شاہ غلام علی عزالمتوئی (۱۲۴۰ھ) بھی اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے
 ایک خدارسیدہ بزرگ ہیں جو زمانے میں فقر غیور کے والے سے متعارف ہیں
 جس طرح شعلہ و شبنم کی یکجائی بخوبی روزگار ہے اسی طرح میر و فقیر کی ہم آغوشی بھی
 باعث ہزار تعجب ہے اسی لیے فقر و تر کی آپس میں کبھی نہیں بنی بلکہ ٹھنی رہی ہے
 امارت نے بار بار سترے جال تے، مگر فقر کا ترغ و حشی بہت کم ہی زیر دام آیا اگر
 ایسا ہوا ہے تو وہ فقر میں ابھی پر مارستہ ہوگا ورنہ طائر لاہوتی اور اڑ کے آئے
 ایک دانے کے لیے، یہ قطعاً ممکن نہیں، حضرت شاہ غلام علیؒ بھی ایسے ہزار دام سے
 ایک جنبش میں نکل آئے تھے، اوریوں فقر غیور کی تاریخ میں ایک سترے باب کا
 اضافہ کر دیا، سرسید احمد خانؒ کہتے ہیں:-

”ایک دفعہ نواب امیر الدولہ امیر محمد خان والی لڑکے نے بہت التجا سے
 درخواست کی کہ یہ وظیفے کا فقر منظور فرمایا جائے اس کے جواب میں
 آپ نے صرف یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:-

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم بامیر خان بگوی کہ روزی مقرر است
 ان الفاظ پر اس موضوع کو ختم کیا جاتا ہے اور ایک بار پھر ہم اس بات کا اعادہ
 کریں گے کہ ذرا توجہ اور گہرائی سے جاننے کی کوشش کیجئے کہ تصوف کیا ہے؟ اور باب
 تصوف کیا تھے؟ ان کی سیرتیں اور شخصیتیں کس پائے کی تھیں، جب ساحل سے کبھی اندازہ
 طوفان نہیں ہو سکتا، جب شادری کے بغیر کبھی موتی ہاتھ نہیں آسکتا، تو یہ نا انصافی
 صرف تصوف سے کیوں برتی جاتی ہے؟

تاج شہی فقر کے قدموں پر

ہم "فقرِ غنیور" کے عنوان میں وضاحت سے لکھ آئے ہیں کہ صوفیاء کرام کی عظمت و جلالت کا راز ان کے فقرِ غنیور میں پوشیدہ تھا، جب فقرِ آدابِ خود آگاہی کا معلم بنتا ہے تو انسان کو اپنی منزلِ آسمانوں سے بھی پرے نظر آتی ہے، فقرِ بجائے خود فخر ہے فقر کے حسین چہرے کو مزید کسی غارے کی ضرورت نہیں ہوتی، فقر کے رستے دلائلِ اہم کو مشاطہِ نظرتِ خود سنوارتی نکھارتی ہے۔

تاریخِ تصوف کا جہاں ہر باب بعیرتِ افروز ہے وہاں دلچسپ بھی ہے ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں کہ عقل درِ طہ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتی ہے، یہ تو بار بار ہوا کہ قہرِ مرنے سے نگاہیں کٹیا کی طرف اٹھیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ جھوٹپڑی کی درز سے کبھی نظروں نے فلک بوس محلوں کا طواف کیا ہو، یہ نگارہ تو ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ مری محل سے اکتا کر شاہانِ وقت گھانس پھونس کی جھوٹپڑی میں اگر عافیت کے طالب ہوئے مگر اس کا ایک بھی گواہ نہیں کہ بوریائشیں نے شاہوں کی چوکھٹ پر سر نیاز جھکایا ہو، دارِ شان کے وجہ تو تاج و تخت سے اکتا گئے مگر بود و سلمان کے مسند کشین کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے، تاریخ نے شاہوں کو آتے دیکھا لیکن گداؤں کو جاتے نہیں دیکھا امیروں کو کھتر کے چھترے اس آگے لیکن فقیروں کو سریر و پرزیاں، کانٹوں کا اور صاوا لگے۔

تاج زر اور خرقہ فقر کی داستان بڑی ہی عجیب و غریب ہے، تخت کے موتی اور میرے وہ کچھ نہ دے سکے جو بیابان کے ذروں نے دیا، کلاہ خسروی اس قدر باغ کو اونچا نہ کر سکی جتنا کہ دوتی کی ٹوپی نے کر دیا، سکندر گھڑی گھڑی بٹلتے رہے مگر قلندر جہاں تھے وہیں رہے کیوں کہ یہی انسانیت کی معراج گہری ہے، سکندر کو تخت و تاج سیر چشتی نہ دے سکے مگر قلندر کو فقر نے تو نگر بنا دیا، اب آئیے تاریخ کے دامن پر پھر سے موتی چنیے، نید اشرف جہانگیر، شیراز کے حاکم اعلیٰ، ۱۶۵۷ء میں وفات پائی، آپ کے بارہ میں آتا ہے۔

آپ نے اپنی والدہ کی اجازت سے سمنان (شیراز) کے تخت سلطنت کو چھوڑ کر فقر و صوفی اختیار کیا۔

حاکم شاہ، کچھ کرمان کے گورنر تھے، ۱۶۶۰ء میں وفات پائی، آپ کی کایا کلب کا حال ملاحظہ ہو، ڈاکٹر شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

”شاہ رکن عالم مسکنی کے سر پرست تھے، گورنری چھوڑ کر ارشاد و ہدایت اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گئے، اوج اور سکھ کا درمیانی علاقہ آپ کا مرکز بنا۔“

وقت کے صاحبِ جلالت، ہمیت بادشاہِ فقیروں سے ملنے کا شوق دل میں پیدا کیے رہے مگر اللہ والوں کے دل میں کبھی شاہ کی ملاقات نے چٹکی نہیں لی، ان کے نزدیک لوگوں کے دین کے لیے دنیا اور دنیا داروں کا قرب بکریوں کے لیے بھیڑیے کی نسبت زیادہ نقصان دہ تھا، بادشاہ کے کہہ کر نے فقیر کے دل کو نہیں بٹھایا لیکن اربابِ تخت و تاج ان کے ہاں حاضری کو دنیا و آخرت کی سعادت سمجھتے رہے،

حضرت شیخ برہان الدین مرغینانی صاحب المدایہ کے شاگرد، شیخ برہان الدین

بلخی کے بارہ میں شیخ مرغینانیؒ کی پیشین گوئی تھی،

یہ بچہ اس قدر عظیم و علیل ہو گا کہ بادشاہ اس کے دروازے پر حاضری کو سعادت سمجھیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا، سلطان غیاث الدین بلبن ہمیشہ جمعہ کی نماز کے بعد شیخ برہان الدین بلخیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، لے کہ حضرت شیخ قطب الدین کاشانیؒ جہاں ایک طرف مرجع عوام تھے وہاں وہ مرجع خواص بھی تھے، حلقہ ارادت میں ممتاز مشائخ سے لے کر علیل القدر بادشاہ تک شامل تھے، ہزاروں لاکھوں لوگوں کے مرشد و رہنما خواجہ بہار الدین ذکریاؒ بھی ان میں سے تھے جن کے دل شیخ کاشانیؒ کی عقیدت اور محبت سے لبریز تھے، یہی وجہ ہے کہ شیخ کاشانیؒ ایک دوسرے کے موقع پر جب تک ملتان ٹھہرے رہے، خواجہ بہار الدین ذکریاؒ روزانہ صبح کی نماز ان کے پیچھے جا کر بیٹھتے اور نیاز حاصل کرتے، شیخ کاشانیؒ جب ملتان کے راستے دہلی تشریف لے گئے تو سلطان شمس الدین التمش شہنشاہ ہند نے بنفس نفیس باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا اور دعائیں حاصل کیں۔

انہی سلطان شمس الدین کا بیٹا شہزادہ ناصر الدین بھی اپنے والد کی طرح الشہداء کا عقیدت مند تھا جب وہ ملتان اور اوج کے دورہ پر گیا تو اوج دھن (پاک پٹن) میں شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی قدمبوسی کی۔

سلطان شمس الدین التمش، باوجود شہنشاہ ہونے کے خود بھی متقی اور مقرر انسان تھا اگر وہ خلعت شاہی کے بجائے صوف کا خرقہ اور کلاہ خسروی کی جگہ کلاہ فقر اور لیتا تو وقت کا صوفی اور شیخ ہوتا تاہم اس کے صانع، پرہیزگار اور متدین ہونے پر ایک زمانہ متفق ہے، سلطان کو محلہ دیگر بزرگوں کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ خلیفہ اہل خواجہ معین الدین حسن دہشتیؒ سے خصوصی عقیدت تھی، دار الحکومت دہلی میں جب شیخ ملتان سے آئے تو سلطان نے خدا کا شکر ادا کیا اور شہر سے باہر نکل کر آپ کا

خیر مقدم کیا خواجہ حامد بن فضل اللہ جمالی شیخ اور سلطان کے باہمی روابط اور سلطان کی مخلصانہ عقیدت کے متعلق تحریر کرتے ہیں :-

”سلطان ہفتے میں دو بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ سے فیض حاصل کرتا۔ چونکہ آپ کی قیام گاہ شہر سے باہر اور ذرا فاصلے پر تھی، سلطان نے عاجزی سے درخواست کی کہ اگر براہ کرم دعائیت آپ شہر کے نزدیک قیام پذیر ہوں تو بہت بہتر اور نہایت خوب ہو آپ نے سلطان کی درخواست منظور کر لی۔“

آپ ان واقعات سے اندازہ فرماتے جاسیے، شانِ فقر اور عظمتِ فقر کا اور سماجِ شہی فقر کے قدموں پر کی جھلکیاں ملاحظہ کرتے جاسیے۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح جنہیں دو بادشاہوں کا زمانہ ملا۔ بایں ہمہ فقیر لے کبھی شاہوں کی جانب التفات نہ کیا مگر شاہ ”بابِ فقیر“ سے مستغنی نہ رہ سکے، دراصل وہ خوب جانتے تھے کہ نعم الامیر علی باب الفقیر۔۔۔۔۔ میں دونوں کی عزت ہے، صاحب سیر العارفین شیخ ابوالفتح کی دہلی آمد کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”شیخ دومرتبہ سلطان علاؤ الدین اور تین بار سلطان قطب الدین کے زمانے میں دہلی تشریف لائے سلطان علاؤ الدین باوجودیکہ آشوبِ چشم میں مبتلا تھا مگر آپ کے استقبال کے لیے سوار ہو کر گیا اور نہایت اعزاز کے ساتھ آپ کو شہر میں لایا۔“

سیر العارفین کے مصنف شیخ ابوالفتح کی بادشاہوں سے ملاقات، اسکی غرض اور شاہوں کے طرزِ عمل کی روداد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء اگر کبھی شاہوں کے دربار میں گئے تو دو مقاصد کے علاوہ قیصر کوئی مقصد نہ تھا، ایک تبلیغِ حق اور وعظِ نصیحت دوسرے حاجت مندوں کی حاجت برآری کے لیے

دور نہ صوفیاء کرام کو نہ کبھی شاہی دربار سے دلچسپی رہی اور نہ شاہوں سے ملاقات کا شوق تاریخ کی گواہی دیکھئے۔

شیخ زکین الدین ابوالفتح سلطان قطب الدین سے ملنے شاہی محل جاتے تو لوگوں کی ڈھیروں عرضیاں ہمراہ رکھتے، میسر میسر وزیر سلطان آپکا استقبال کرتا اور اندر لے جاتا، دوزانو ہو کر بآداب آپ کے سامنے بیٹھ جاتا اور آپ کی تشریف آوری کو بہت بڑی عنایت اور نعمت تصور کرتا، آپ اپنے خادم کو حکم دیتے کہ وہ لوگوں کی عرضیاں لائے، سلطان تمام عرضیوں کو پڑھتا، مناسب حکم دیتا اور آپ اس وقت تک واپس نہ جاتے جب تک مخلوق کے تمام معاملات طے نہ ہو جاتے۔ اسی مصنف نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش کے حسن عقیدت کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

”شیخ تبریزیؒ بغداد سے دار الخلافہ دہلی آئے تو سلطان شمس الدین التمش نے دہلی سے باہر آکر آپ کو خوش آمدید کہا جب آپ ابھی دور ہی تھے، سلطان کی نظر پڑی تو احتساراً گھوڑے سے اتر پڑا اور والہانہ انداز میں مصافحہ کیا۔“

تاریخ کے صفحات میں ہمیں ایسے واقعات جا بجا ملتے ہیں جو اس امر کی مستند گواہی کی حیثیت رکھتے ہیں کہ عیسویوں شہنشاہ ان بندگان خدا کی خدمت اور ارادت کو اپنا قیمتی اثاثہ تصور کرتے اور ان سے تعلق کو عزت سمجھتے تھے، سچ ہے جو خدا کا ہو گیا دنیا اسی کی بن گئی، جو اس سے پھر دنیا بھی پھر گئی، ان حقائق کا انکار کیوں کر ممکن ہے کہ وقت کے باجبروت سلاطین نے صوفیاء و اولیاء کی عقیدت کا قلاوہ اپنے گلے میں ڈالا اور اسے موتیوں کا ہار سمجھا، ہر حیا جانے والی رات اور نکلنے والا دن انکی عقیدت

ارادت میں برابر اضافہ کرتا جاتا، شہنشاہ ہند فیروز تغلق کو شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی سے بے حد عقیدت تھی، سلطان علاؤ الدین خلجی، خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا مرید تھا، جلال الدین خلجی بھی آپ سے نیاز مندی کا شرف رکھتا تھا، سلطان احمد خان بہمنی، سید محمد گیسو دراز کا ارادت مند تھا، دلی ہرات شاہ حسین خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا معتقد اور باتا عدہ آپ کے سلسلے سے منسلک تھا۔ حاکم بیجا پور ابراہیم عادل شاہ ثانی پیر ہاشم گجراتی کا ارادت کیش تھا، سلطان نصیر الدین ہمایوں شیخ حامد بن فضل اللہ عمالیؒ کے عقیدتمندوں میں سے تھا، یہ اور ایسی سینکڑوں مثالیں ہمارے مدعا کو واضح کرتی ہیں کہ بوریہ نشینی میں عرش نشینی کا مزہ صوفیاء نے لوٹا ہے اور یوں فقر کی للج رکھی۔

سلطان محمد جلال الدین اکبر جسے مہتمم، مدبر، صاحب کز و فر اور شان و شکوہ کے لحاظ سے "مغل اعظم" کہا جاتا ہے، اپنی تمام تر سلطوت و وجاہت کے ساتھ فقر ار کی جھگیوں کا طواف کرتا اور اس طرح تاریخ کا ایک نیا اور زریں باب رقم ہوتا، وقت کا شہنشاہ جو پچاس برس تک پورے دبدبے سے حکومت کرتا رہا۔ فقیروں کے ہاں یوں نظر آتا کہ وہ خادموں میں سے ایک ہے، جب آتا تو دہن سے سکندری نکال کر آتا اور دل میں بجز ارادت و جذبہ خدمت کے اور کچھ نہ ہوتا، صدر الصدور شیخ عبد الباقیؒ کے ساتھ اکبر کی ارادت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ :-

"ایک دفعہ جوتے اُن کے سامنے اٹھا کر رکھے، شہ

دلی الہند خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ عقیدت و ارادت ذیل کے الفاظ سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

"اکبر سال بسال اجمیر جانا کوئی مہم ہو یا اس کے علاوہ بھی، ایک منزل سے پیادہ پا جاتا اور بعض مہینے (خصوصاً جہانگیر کے تولد سے پہلے) تو ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پیادہ گیا۔" ۹

اکبر بادشاہ شیخ سلیم حشّی کا بھی بے حد معتقد تھا، شیخ سلیم ہی کے نام پر اپنے بیٹے کا نام سلیم رکھا جو بعد میں شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا، شیخ سلیم بابا فرید شکر گنج کی اولاد سے ہیں، حجاز، روم، بغداد اور نجف کی سیاحت فرمائی، بعد ازاں فتح پور سیکری میں اقامت پذیر ہوئے۔ اکبر نے سلیم کی پیدائش کے دو برس بعد شیخ سلیم حشّی سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طریقے پر کیا۔

”خانقاہ شیخ کو ردو معانی و عرفانی چشمہ جان کروہاں ایک شہر تعمیر کروایا چنانچہ ۱۵۷۱ء میں فتح پور کی شاندار عمارتیں غنی شروع ہوئیں اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہ ہند کا پایہ تخت ہو گیا۔“

خواجہ محمد زبیر سرہندی المتوفی ۱۱۵۱ھ سے امرار اور اعیان سلطنت کی عقیدت و ارادت کی یہ کیفیت تھی۔

جب شیخ ”مکان سے مسجد تشریف لے جاتے تو امرار راستہ میں دو شالہ اور رو مال بکھا دیتے کہ آپ کا پاؤں زمین پر نہ پڑے“ لہ
حجۃ اللہ فی اللہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے مختلف مشائخ کرام سے بڑے بڑوں کی ارادت کا حال بیان فرماتے ہیں، شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبد الرحیم کا کہنا ہے :-

”جب شیخ آدم بنوری کی شہرت عام ہوئی تو دھوم شایعہاں تک پہنچی، شاہ نے وزیر سعد اللہ خان اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کو بھیجا تاکہ حقیقت حال کا علم ہو، دونوں شیخ کی خدمت میں پہنچے، شیخ مراقبہ میں تھے، کافی دیر دروازے پر بیٹھے رہے، جب شیخ حالت مراقبہ سے باہر نکلے تو دونوں آپ کے حجرے میں داخل ہوئے، شیخ ان کی تعظیم بجا نہ لائے یہ دیکھ کر دونوں بگڑ گئے، سعد اللہ خان نے کہا میں تو اہل دنیا میں سے

ہوں مگر ملاحظہ الحکیم تو عالم دین ہیں ان کی تعظیم ضروری ہے آپ نے
جواب ارشاد فرمایا حدیث میں وارد ہے:-

العلماء أئمة الدین عالم یمخاطبوا الملوك ماذا خاطروهم
فہو اللصوص۔

(علماء دین متین کے پریدار اور مخاطب ہیں جب تک صحبتِ امراء سے
دور رہیں جب انہیں صحبتِ امراء اس آجائے تو وہ چور ہیں) ”^۱
ایک دن بہمن یار خان لباس ماخرہ زیب تن کر کے حضرت خواجہ میر خور
صاحب سیرالاولیاء کی خدمت میں آیا۔ اس وقت آپ کے گھر
میں کوئی فرش نہیں تھا لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، بہمن یار خان بھی
زمین پر بیٹھ گیا۔ حاضرین میں سے کوئی شخص اٹھا اور خواجہ کے کان میں کہا
”یہ بہمن یار خان ہے اس کی تعظیم کرنی چاہیے۔“ خواجہ صاحب نے باواز
بلند فرمایا ”اگر بار ہے تو محتاج تعظیم نہیں اگر غیر ہے تو لائق تعظیم نہیں۔“^۲
حضرت میاں میر قادری لاہوری کے دروازے پر بھی کئی بار شاہوں نے دستک
دی اور نیاز بجالائے، آپ کے عقیدہ مند دل میں سرِ فرست شاہجہان کا نام ہے۔
آپ کے ساتھ شاہجہان اور شہزادہ بلند اقبال کی عقیدت کس قدر تھی؟ تاریخ میں اس
کا متعدد جگہوں پر ذکر ملتا ہے، تذکرہ مشائخ قادریہ کے مولف لکھتے ہیں:-

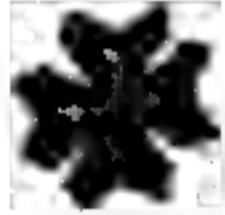
”جب شاہجہان لاہور آیا تو شہزادہ بلند اقبال بھی اس کے ساتھ حضرت
میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا، دوسری بار وہیں میں نے بعد جب شاہجہان
حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت بھی شہزادہ ہمراہ تھا
اس وقت شہزادہ کی ارادتمندی کا یہ عالم تھا وہ آپ کے مکان کی دوسری
منزل میں جہاں آپ کا قیام تھا برہنہ پا گیا اور جو لوگ وہ چبا کر کھینکتے جاتے

تھے انہیں اٹھا کر کھانا رہا۔" گلہ

حضرت شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی جو اس صدی کی بڑی با اثر و حسانی شخصیت گذری ہیں اپنی درویش منشی، سادگی، غیرت، فقر اور تلہیت کے باعث خاصی مشہور ہیں، آپ کے در دولت کو نبھانے کتنے امیروں، رئیسوں، نوابوں اور منصب داروں نے چوما کتنے گج کلاہ سلامی دیئے آئے اور کتنے سریر آراء جاروب کش بنے، آپ کی کشش کا یہ عالم تھا کہ ایک زمانہ امنڈ اچلا آتا، مسلمان امراء کا تو کسب اکنا غیر مسلم ارکان سلطنت کو بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق رہا اور دل میں جذبہ عقیدت موجزن رہا، برصغیر پاک و ہند کے نامور مصنف اور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں -

"ایک دفعہ صوبیات متحدہ اگرہ دادھ کے لینٹینٹ گورنر نے آپ سے ملنے کی اجازت چاہی آپ نے لوگوں سے فرمایا میں تو ایک فقیر آدمی ہوں ان کے بیٹھنے کا کیا انتظام ہوگا، اچھا ایک کرسی منگالینا، لینٹینٹ گورنر کی طرف سے تاریخ اور وقت بھی مقرر ہو گیا اور آپ لوگوں سے یہ کہہ کر بھول بھی گئے، یہاں تک کہ لینٹینٹ گورنر معہ چند حکام اعلیٰ موجود ہوئے سب کھڑے تھے ایک میم بھی کھڑی تھی شیخ نے اسے کھڑے کی طرف اشارہ فرمایا کہ "بی تو اس پر بیٹھ جا" لینٹینٹ گورنر نے کچھ تبرک مانگا۔ آپ نے ایک خدام سے فرمایا کہ بھائی دیکھو میری ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دے دو، اس میں سے کچھ چورا مٹھیاں کالکلا بس سب کو عتوڑا عتوڑا تقسیم کر دیا، سب نے ادب اور خوشی سے قبول کیا اور عتوڑی دیر بیٹھ کر اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے چلتے وقت نصیحت کی درخواست کی فرمایا "ظلمت کزناڑا ملے"

ان تمام تاریخی، مستند اور مضبوط حوالوں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ
 من تو اضیع لله مفعہ امثہ، جو خدا کے ہاں سرتنگوں ہو، خدا اُسے سر بلند
 کر دیتا ہے، خادم بن کر رہنے سے خدا مخدوم بنا دیتا ہے، صوفیاء نے بلاشبہ
 یہی طریقہ اختیار کیا تو اللہ نے انہیں عزیز جہاں بنا دیا۔



تعلیمات تصوف

اب تک ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ تصوف شریعت کے علاوہ یا اس سے ہٹ کر کوئی ادارہ یا تحریک نہیں بلکہ شرعی احکام و مسائل کے ضمن میں لوگوں کے اندر آمادگی اور شوق ابھارتا تصوف کا اصل کام ہے یوں تو نماز ادا اے ارکان کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے لیکن تصوف حضور قلب پیدا کرنا چاہتا ہے، روزے کے ساتھ ضبط نفس کا اہتمام تصوف کا مشاء ہے، زکوٰۃ ادا کرتے وقت سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دینے کا عزم تصوف کے پیش نظر ہے، تصوف حج کو دنیا کے غیر ضروری مشاغل اور مہنجٹوں سے آزاد کر دینے کا ذریعہ بنا دینا چاہتا ہے، اسی طرح دیگر تمام فرائض و واجبات کے سلسلہ میں تصوف کی نظر اس کی اصل غایت اور روح پر رہتی ہے۔

اسلام جب ایک تحریک اور انقلاب کے طور پر دنیا کے سامنے آیا اور دنیا کے بیشتر حصے میں حکمران دین کے طور پر متعارف ہوا تو یہ بات قاعدہ ایک ایسا ادارہ بن گیا۔ جس کے کئی شعبے ہوں اسلام محض مذہب ہوتا تو اس کے پیروکاروں کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ زاہد متواضع، عبادت گزار، شب بیدار اور تسبیح خوان بن جائیں لیکن یہ دین تھا اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی اور محیط تھا، اس دین کے لیے ضروری تھا کہ اس کے ماننے والوں میں جرنیل بھی ہوں اور سیاستدان بھی، عابد و زاہد بھی ہوں اور عالم اور محقق بھی، مفسرین کی ایک جماعت بھی ہونی چاہیے اور محدثین کی بھی، مصلحین

اسلام کے گروہ کی ضرورت بھی تھی اور فلسفیان اسلام کی بھی، سو وقت گزرنے اور دائرہ اسلام وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ تمام شعبے خود کفیل ہوتے چلے گئے، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، فلسفہ، منطق، مناظرہ، سیاسیات، سپہ گری اور سفارت کاری یہ اور ایسے دیگر علوم و فنون مستقل حیثیت اختیار کر گئے، اسلام بین الاقوامی دین بنا تو بین الاقوامی تعلق بھی پیدا ہو گئے، اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بے پناہ صلاحیت کار کی ضرورت تھی، اس امر سے ہر شخص متفق ہے کہ جو چیز جتنا اپنا دائرہ اثر وسیع کر لیتی ہے اس میں اتنی ہی کمزوری پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں فطرثاً ایسا ہو ہی جاتا ہے، یہ کچھ اسلام کے اندر بھی ہوا، اسلام کا اصل مدعا اور مقصود حقیقی دنیا کے لیے بہترین اور باصلاحیت انسان فراہم کرنا تھا اور اسلام نے اس مقصد کو کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا، لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ مختلف شعبے اپنے نام کے ساتھ تو قائم رہے لیکن مقصدیت کا فقدان صاف طور پر محسوس ہونے لگا، اسلام صرف لشکر و سپاہ ہی پر اکتفا نہیں کرتا، وہ لشکر و سپاہ کو "بجذ اللہ" کے روپ میں دیکھنا چاہتا، اسلام قرآن اور اس کی تفسیر کے منہن میں محض شان نزول، اقسام وحی، تقسیم سور، ناسخ و منسوخ، آیات مکیہ و مدنیہ، تادیل و تعبیر، حروف مقطعات اور حکامات و متشابہات کے علم کو کافی نہیں سمجھتا، جب تک کہ روح قرآن دل میں نہ اتر جائے، وہ ایسے محدثین چاہتا ہے جو احادیث کے ضعیف و قوی، صحیح و حسن اور ناسخ و منسوخ جاننے کے ساتھ ساتھ مزاج شناس رسول ہوں تاکہ اطاعت میں محبت کی کیفیت پیدا ہو جائے، اسلام فقہاً اصل میں انہیں سمجھتا ہے جو نرے طہارت و وضو، صبح و شرا، قراض و رہن اور لیعان و ظہار کے مسائل ہی نہ جانتے ہوں، بلکہ انہیں دین کی حکمت سے پوری واقفیت ہو اور دل و جان سے اس علم پر عمل کرنے والے ہوں اور اسی طرح اسلام کا فلسفہ اور علم کلام کے منہن میں بھی اپنا ہی مزاج ہے، مگر

اسلامی حکومت کی حدود میں وسعت، پیروکاروں کی ان گنت تعداد، مختلف ملکوں کے تمدن کے اثرات، دیگر قوموں کی عادات اور مقامی رسوم و روایات کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر مختلف اثرات مرتب ہوئے، نتیجے کے طور پر صورت میں تو تبدیلی نہ آئی البتہ معنی بدل گئے، یوں تو مسلمانوں میں اچھے جرنیل بھی تھے، معشر اور محدث بھی، متکلم بھی اعلیٰ درجے کے اور مناظر بھی بلند پایہ، فقہاء کی کمی بھی نہ تھی اور سیاستدانوں کی بھی، لیکن معیاری انسان کم سے کم تر ہوتے چلے گئے، ایسے انسان جن میں تقویٰ، احسان، مروت، صبر، سماعت، فتوت، انکساری، بذل و سخا، سوز و گداز، رفق و لطف، عفو و درگزر، ملہیت، قناعت، صدق، سادگی، توکل اور تسلیم و رضا کے اوصاف بدرجہ اتم ہوں، کہ یہی معراج انسانیت اور مقام آدمیت ہے۔

تصوف کو یا قاعدہ ایک ادارے اور تحریک کی شکل دینے کی ضرورت محض اس لیے پیش آئی کہ وہ متذکرہ صدر کام سرانجام دے کہ جو شخص جیسا اور جس شعبے میں ہے وہیں رہے لیکن اس میں بنیادی انسانی اوصاف و خصال نفس اور اخلاق فاضلہ کا ہونا سب سے اہم چیز ہے۔

تصوف نے جو بھی خدمات سرانجام دیں اور جس بھی درجے میں اپنے اثرات پھوٹے اس سے یہ تو نہیں ہوا اور نہ تصوف اس کا دعویٰ کرے کہ تفسیری نکات اور محدثانہ اصطلاحات میں اضافہ ہوا ہو، فقہی ابواب کی از سر نو ترتیب ہوئی ہو، علم کلام کے نئے ادارے وجود میں آئے ہوں البتہ اس سے انکار بہت ہی دشوار ہے کہ تصوف نے دنیا کو مخلص، بے ریا، باخدا، متواضع، راستباز، دردمند، بخیر و جور، متوکل، قانع، صابر و شاکر، سادہ اور ایثار پیشہ انسان بنایا ہے۔

مختلف علوم و فنون پر جب ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جانے لگیں لیکن ان کا انسانی اخلاق سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا زیادہ سے زیادہ انہیں داویہ تحقیق ہی

دی جاسکتی تھی تو صوفیاء نے اسے عبث کام سمجھتے ہوئے لوگوں کو ہدایت کے بنیادی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کی تعلیمات سے روشناس کرایا ایک محقق جب کتاب لکھتا تو ان مسائل کی تحقیق جستجو کرتا، جبر و قدر، خلق قرآن، ملائکہ اور جنات کا وجود جنت کی مابیت، رفع عیسیٰ، ولادت مسیح اور ایسے ہی دیگر مسائل، لیکن صوفیاء نے ان مسائل کے مقابلے میں توبہ و انابت، زہد و ورع، خشوع و خضوع، تسلیم و رضا، صبر و شکر توکل علی اللہ، عجز و انکسار، فقر و قناعت، عزم و استقامت، ایثار و اخلاص، صدق و صفا خوف و خشیت اور حکمت و بصیرت ایسے مضامین کو اپنی کتابوں کی زینت بنایا۔

اب یہ ہر معقول شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ انسانیت کو کن مضامین اور ایک معیاری انسان بننے کے لیے کن مسائل کی ضرورت ہے۔

بنیاد بریں ہم نے روح تصوف کے ضمن میں ضروری سمجھا کہ تصوف کی اصل تعلیمات کا ایک باب بھی ہونا چاہیے تاکہ تعلیمات کے ذریعے تصوف کا اصل تعارف ہمارے سامنے آجائے چونکہ اخلاق عالیہ کی ایک قیمتی فہرست ہے اور ہر عنوان پر بحث بات کو طویل بنا دے گی، اس لیے چند ایک عنوانات منتخب کر لیے گئے ہیں اور ان پر بھی مختصر گفتگو کی گئی ہے، ان میں توکل، فقر، توبہ، تقویٰ، اخلاص، صبر، فتوت شامل ہیں۔

توکل

توکل تصوف کی تعلیمات میں سب سے نمایاں اور اہم مقام توکل کو حاصل ہے بلکہ یوں کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ توکل فی الاصل تصوف کا دوسرا نام ہے، یہی وہ صفت ہے جو انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا اور قوتِ کار میں اضافہ کرتی ہے، اور ثمرات کی خیر سنی اور لذت کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر کوئی شجر طیب نہیں، اس لیے کہ بندہ اپنی تمام محنت و مشقت، جدوجہد اور سعی و کادش کے بعد جب نتائجِ شکر پر چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سان و گمان سے بڑھ کر اپنے بندہ کو عطا کرتا ہے، صفتِ توکل کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ قرآن مجید میں اسلام اور ایمان دونوں کو توکل کے ساتھ لازم و ملزوم دکھایا گیا ہے: مثلاً -

فعلیہ توکلوا ان ڪنتو مسلمین -

اس پر توکل کرو اگر تم مسلمان ہو۔

نیز ارشادِ خداوندی ہے:-

و علی اللہ فتوکلوا ان ڪنتو مومنین -

پس اللہ پر توکل کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

توکل کا نہ صرف اسلام اور ایمان کے ساتھ چولی و امن کا ساتھ ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے، انبیاء علیہم السلام جہاں اپنے لیے توکل علی اللہ کو ضروری قرار دیا وہاں اپنی امت کو بھی اسی کی تعلیم دی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا -

marfat.com

Marfat.com

علی اللہ توکلنت

پس میں نے الشد پر توکل کیا۔

حضرت شعیبؑ کا فرمانا ہے۔

علی اللہ توکلنا

ہم الشد ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو توکل کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

یا قوم ان کنتم آمنتم باللہ فعلیہ توکلوا۔

(اے میری قوم، اگر تم الشد پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو۔)

اسی طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسی توکل علی اللہ کو اپنا اور صنا بھوتا

قرار دے لیا تھا اور آپ ہر مقام پر سیکر توکل نظر آتے ہیں قال اور حال دونوں میں توکل

کا رنگ نمایاں ہے، کہیں آپ کو الشد پر توکل کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، کہیں آپ کی

زبان سے الشد پر توکل کرنے کا اظہار کروایا جا رہا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ربانی ہے۔

و توکل علی العزیز الرحیم

اور آپ خدائے قادر و رحیم پر توکل کیجئے۔

دوسرے مقام پر آنا ہے۔

قل هو ربی لا الہ الا هو علیہ توکلنت والیہ متاب

آپ فرما دیجئے وہ میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے

اسی پر توکل کر لیا اور اسی کے پاس مجھے جانا ہے۔

غرضیکہ تمام انبیاء علیہم السلام اپنے طور پر خود بھی متوکل علی اللہ رہے اور دوسرے

کو بھی اسی کی برابر تعلیم دیتے رہے۔

marfat.com

Marfat.com

اب ہمیں تفصیل میں جائے بغیر دیکھنا یہ ہے کہ توکل کا حقیقی مفہوم کیا ہے ؟
 قرآن و سنت توکل کے بارے میں کیا رہنمائی کرتے ہیں ؟ کیا تصوف میں توکل کی تعلیم
 قرآن و سنت کے عین مطابق ہے ؟ سب سے پہلے ذہن کو اس بارہ میں مکیو ہو جانا
 چاہیے کہ توکل ایسا سچ بن کر رہنے، معطل الاعضاء بن جانے، کام چوری، سستی، کاہلی،
 ہنگامہ کائنات سے فرار اور معاشرتی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کا نام ہرگز نہیں، بلکہ مختصر
 الفاظ میں توکل تمام ذرائع و وسائل کو استعمال میں لا کر، امور معاشرت میں پوری دلچسپی
 لے کر، کامل تندرہی اور مکمل عرق ریزی سے کام کر کے نتائج کو اللہ کے سپرد کر دینے کا
 نام توکل ہے، اور یہ یقین اور ایمان اپنے اندر پیدا کر لینا کہ یہ تمام مظاہر محض وسائل
 ہیں حقیقی نتیجہ خیزی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ قرآن مجید میں توکل کا مفہوم یہی
 ہے کہ پوری کوشش اور محنت کے بعد نتائج اللہ پر چھوڑ دینا، مثلاً حضرت شعیب علیہ
 السلام نے مدتوں ان کو تبلیغ و تلقین کی، اور اس سلسلے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا
 حضرت نوح علیہ السلام مسلسل کئی برسوں تک لوگوں کو تلقین و تبلیغ کرتے رہے اور کوئی
 دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا، جتنا ایک انسان کے بس میں ہو سکتا تھا وہ شعیب علیہ السلام
 نے کیا اور پھر آخر میں فرمایا :-

ان اريد الا صلاح ما استطعت وما توفيقى الا بالله عليه

توکلت و الیہ اُنیب ۔

میں نے تو جہاں تک ممکن ہے اصلاح کا ارادہ کیا ہے اور مجھے توفیق
 اللہ ہی سے ملی ہے اس پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع
 کرتا ہوں ۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ہے ۔

و شاورهم في الامر فاذا عزمت فتوكل على الله

marfat.com

Marfat.com

اور تم حکومت کے معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کر لیا کرو اور اس کے نتیجے میں، جب کسی بات کا پکا ارادہ کرو تو پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔
 المنقہ قرآن مجید میں کہیں عزم کے بعد کہیں بقدر وسعت و طاقت اصلاح قوم کے بعد توکل کا اعلان کیا گیا ہے، پتہ چلا کہ کوشش نہ کرتا اور وسائل کام میں نہ لانا اور پھر اسے توکل کا نام دینا قرآنی نصوص کے خلاف ہے۔ اعتقاداً تم توکل کی حدیث زبان زد خاص و عام ہے، اس کائنات میں سرور عالم سے بڑھ کر کون متوکل ہو گا مگر کسب آپ کی سنت ہے اور آپ برابر اس کی تلقین فرماتے رہے۔ اس ضمن میں امام ابو القاسم قشیریؒ نے بڑی بصیرت افزا اور خوبصورت بات کہی ہے۔
 ان التوکل محلل القلب والحركة بالظاهر لا تنافي التوکل بالقلب۔

توکل کا مقام دل ہے لہذا اس صورت میں ظاہری حرکات توکل کے منافی نہ ہوں گی۔

توکل دو حالتوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا، ایک صبر، دوسرے شکر، اگر عام نتائج متوکل کی منشاء کے مطابق پیدا ہوں تو شکر کا مقام ہے اگر ایسا نہ ہو تو صبر کرنا چاہیے ظاہر ہے دونوں باتیں ایمان کی شاخیں ہیں۔ بنا بریں شیخ ابوسعید خدریؒ نے توکل کو اضطراب بلا سکون اور سکون بلا اضطراب کا نام دیا ہے۔

جب ہم اہل تصوف کی سیرتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان نفوس قدسیہ میں توکل یوں رچا ہوا تھا جیسے رگوں میں خون ایسی وجہ ہے کہ وہ لوگ ہر حال میں خوش و خرم رہے، مصائب و آلام کی آندھیاں انہیں متزلزل نہ کر سکیں، مشکلات اور رکاوٹیں ان کا راستہ نہ روک سکیں، خدا پر اعتماد اور توکل کا نتیجہ تھا کہ زندگی بھر ان کی پیشانی کسی امیر کے دروازے کی آلودگی سے بچی رہی، کسی بادشاہ کے شرمندہ

احسان نہ ہوئے، وہ جو کے ان چھنے آٹے کی روٹی میں مرغ و ماہی کی لذت محسوس کرتے رہے۔ ببول کے کانٹوں سے آٹے راستوں پر چلتے ہوئے باغ کی روشنیوں پر آمستہ خرامی کا مزہ لیتے رہے، ایک ہی پٹی پرانی کبیل کو اوڑھنا بچھونا بنا کر لیٹنے کے باوصف بنجاب و سمور کے نرم و گداز بستروں کا لطف اٹھاتے رہے، کھاری اور گرم پانی حلق سے انڈیلنے پر آب کوثر و تسنیم کا حظ حاصل کرتے رہے، گھاس پھوس کی شکستہ جھونپڑی میں شاہی ایوان و محل کا نظارہ کرتے رہے، وہ پاک باز اور قدسی صفات لوگ اپنا سب کچھ خدا کے پیرو کر کے خود داریں چھیلوں سے آزاد ہو گئے۔ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس میں آلودہ نہ ہوئے اور خلق سے تعلق جوڑ لینے کے باوجود بھی مخلوق سے بے تعلق نہ ہوئے، وسائل کو مصروف میں لائے، ذرائع اختیار کیے مگر نظر ذاتِ خدا پر رہی، پانی سے پیاس بجھانی ضرور مگر ساتی حقیقی خدا کو جانا، روٹی سے پیٹ ضرور بھر مگر رازقِ برحق خدا کو سمجھا، بیماری میں علاج ضرور کرایا مگر شافی مطلق خدا کو کہا، یہ ہے وہ توکل جو تصوف کے عناصرِ ترکیبی کا نمایاں عنصر ہے، اگر اسے فرار، کاہلی، کم کوشی، عافیت پسندی اور سہل انگاری کا نام دے لیجے تو ایسا ضرور کیجے مگر دنیا کو بتلا دیجے کہ حقیقی توکل کیا ہے؟ اب ہم قدیم صوفیاء کرام کی مستند تالیفات و تصنیفات سے واضح کریں گے کہ ان کے نزدیک توکل کا کیا مفہوم تھا؟ کیا ان کی تشریحات قرآن و سنت کے معیار پر پوری اترتی ہیں؟ تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔ مشہور صوفی حضرت سہل بن تری فرماتے ہیں:-

”اللہ کے سامنے ایسا ہوتا کہ جدھر چاہے کھینچ لے جائے توکل کہلاتا ہے۔“

ابو عبد اللہ قرشی فرماتے ہیں:-

”توکل یہ ہے کہ تو اللہ کے سوا اموں کے پاس پناہ لینا چھوڑ دے۔“

جناب ابو بکر شبلیؒ کا کہنا ہے :-
"توکل عمدہ قسم کی لگد آگرمی ہے۔"

جناب سہل بن عبد اللہ قسریؒ فرماتے ہیں :-
"متوکل کی تین قسمیں ہیں۔ رند تو کسی سے مانگے، نذر دکرے، اور نہ جمع رکھے۔"
حضرت یحییٰ بن معاذؒ سے پوچھا گیا "انسان متوکل کب بنتا ہے؟" فرمایا :-
"جب وہ اللہ کو اپنا دکیل بنانے پر راضی ہو جائے۔" ^{۱۰}

امام ابو عمر کا کہنا ہے کہ :-
"خدا کے سوا ہر شے سے ترک تعلق کا نام توکل ہے۔" ^{۱۱} نیز فرماتے ہیں کہ :-
"مبندہ اپنے بدن کے قوام اور تنگی و تکلیف کا خدا کے سوا کسی سے ذکر نہ کرے۔" ^{۱۲}

صوفیاء کرام نے اسباب و ذرائع کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا تاہم اسباب میں مسبب الاسباب کو بھول جانا، اُن کے نزدیک بدترین فعل ہے اسی لیے شیخ جنید بغدادیؒ کے مرشد حضرت ابو جعفر مداد کے بارہ میں آتا ہے، انہوں نے فرمایا :-
"میں نے بیس برس تک اپنے توکل کو ظاہر ہونے دیا اور ہر روز کسب معاش کے لیے بازار میں جاتا رہا۔" ^{۱۳}

بعض اجل صوفیاء کا کہنا ہے کہ متوکل کی مثال اس بچے کی سی ہے جو اپنی والدہ کے ہاتھوں کے سوا کسی جائے پناہ کو نہ جانتا ہو۔ یہی حال متوکل کا ہے اسے راہ طئی ہے تو صرف خدا کی۔ ^{۱۴}

صوفیاء کرام کے نزدیک توکل کے مختلف درجات ہیں اسی طرح متوکلین کے بھی، شیخ ابو علی دقاقؒ اُن کی تقسیم یوں کرتے ہیں :-

"پہلا مرتبہ توکل، دوسرا تسلیم اور تیسرا تفویض، اللہ کے وعدہ پر اطمینان

کہ وہ ضرور حاجت پوری فرمائے گا یہ توکل ہے، یہ عقیدہ کہ اللہ کو میری حالت کا بخوبی علم ہے اسے تسلیم کیا گیا، خدا کے ہر حکم پر رضا مندی، خواہ موافق ہو یا مخالفت یہ درجہ تفویض ہے۔^{۱۰}
 صوفیائے سالار کارواں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ رقمطراز ہیں:-
 ”اگر تو اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے تو تجھے تیرے حال کے موافق بے واسطہ روزی دے گا جیسے ایک طبیب مشفق اور حکیم عاذق مریض کو اس کے حسب حال غذا دیتا ہے۔“^{۱۱}
 ایک شخص حضرت ابو بکر شبلیؒ کے پاس آیا اور کثیر العیال ہونے کی شکایت کی، آپ نے فرمایا:-

”ان افراد کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ کے ذمہ نہیں،“^{۱۲}
 حضرت سلیمان دارانی نے مکہ میں ایک شخص کو دیکھا جو سوائے آب زمزم کے چند گھونٹ کے علاوہ کچھ کھاتا پیتا نہ تھا، ایک دن آپ نے فرمایا فرض کرو، آب زمزم خشک ہو جائے تو پھر کیا کرو گے، اس پر اس شخص نے اٹھ کر آپ کے سر پر بوسہ دیا اور کہا خدا تمہیں نیک جزا دے تو نے مجھے راہِ راست پر لا کھڑا کیا میں تو کئی دنوں سے آب زمزم کو پوجتا تھا۔“^{۱۳}

دہیب بن منبہ فرماتے ہیں:-
 اگر آسمان لوہے کا اور زمین کانسی کی ہو جائے (یعنی کچھ بھی پیدا نہ ہو) اور میں دیکھوں کہ روزی کا غم میرے دل میں پیدا ہو گیا ہے تو میں مشرک ہو جاؤں گا۔“^{۱۴}

حضرت امام غزالیؒ نے توکل کے تین درجات بتائے ہیں:-
 ۱۔ متوکل حال اس شخص کی مانند ہو جس نے مقدسے میں کسی زیرک ذہین، فصیح،

- بے باک اور مخلص وکیل کو مقرر کر لیا ہو اور اس پر کامل اعتماد کرتا ہو۔
- ۲۔ متوکل کی حالت اس بچے کی سی ہے جو اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کو جانتا ہی نہیں۔
- ۳۔ متوکل اس مروجے کی طرح ہو جو غسل کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔
- حضرت بایزید بسطامیؒ نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی، بعد از فراغت امام نے پوچھا یا حضرت آپ مانگتے بھی کسی سے نہیں اور کرتے بھی کچھ نہیں تو گذر بسر کیسے ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا ٹھہرو میں نماز کا اعادہ کر لوں کیونکہ جو اپنے رازق کو نہیں پہچانتا اس کے پیچھے نماز تا جائز ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادمؒ نے ایک راہب سے پوچھا کھاتے کہاں سے ہو؟ جواب ملا اس سے پوچھو جو کھانے کو دیتا ہے کہ وہ کہاں سے بھیجتا ہے مجھے کیا علم؟

یہ ہیں وہ جو اہر پارے جنہیں بغیر کسی اضافی تشریح اور حواشی کے من و عن پیش کر دیا گیا ہے جن سے ایک خاکہ ہمارے سامنے ابھرتا ہے اور صفات طور پر پتہ چلتا ہے کہ تصوف میں توکل کا بعینہ وہی مفہوم ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں ہمیں نظر آتا ہے مختلف اقوال اور واقعات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ توکل درحقیقت اسباب کے پر وے میں سبب الاسباب پر نگاہ رکھنے کا نام ہے اور اپنے آپ کو کلیۃ الشد کی سپردگی میں دے دینا روحِ توکل ہے، الشد پر کامل اعتماد اور یقین ہی دنیا و آخرت کی کامیابی و فلاح کا ضامن ہے، اسی لیے شیخ عبداللہ انصاریؒ نے لکھا ہے کہ "توکل یقین کا پل، ایمان کا ستون اور اخلاص کی منزل ہے۔"

لکھیائے سعادت: ۱۰۷۹، ۵۲ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ: ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵

سعادت: ۱۰۶۰، ۵۵ صمد میدان: ۵۵

marfat.com

Marfat.com

فقر

لفظ "فقر" تنگدستی، غربت اور مفلسی کے معنوں میں آتا ہے یہی مفہوم قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ملتا ہے تاہم ایک حدیث میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کو اپنے لیے فخر قرار دیا، ظاہر ہے فقر کے مذکورہ بالا مفہوم میں جو تحقیر ہے اسے آپ اپنے لیے باعث توقیر قرار نہیں دے سکتے۔ اس لیے فقر کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(۲) فقر اضطراری

(۱) فقر اختیاری

فقر اختیاری واقعہ قابل فخر ہے اور فقر اضطراری خدا کے عذاب کی ایک شکل اسی بحث کو اب ہم مزید طول نہیں دینا چاہتے، صرف فقر اختیاری پر دو چار ضروری باتیں کر کے ہم آگے چلیں گے،

فقر اختیاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان تیش و تکلف اور آسائش و آرائش کے جملہ لوازمات حاصل ہونے کے باوجود درویشانہ زندگی بسر کرے، دولت جمع کرنے پر اشارہ کو ترجیح دے، اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ایک نمایاں مثال ہے، مدنی زندگی کے آخری دور میں فتوحاتِ غنائم کے علاوہ خراج کی بڑی مقدار آپ کے ہاں پہنچ رہی تھی مگر اس سب کے ہوتے ہوئے آپ کی زندگی درویشی اور فقری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اگرچہ آپ بادشاہِ عرب و عجم تھے مگر

وہی گھاس بھونس کا جھونپڑا، وہی پیوند لگا لباس، وہی روکھا سوکھا کھاجا، اور وہی دردناک
 انداز زندگی، ظاہر ہے اگر یہی چیزیں یونہی مسلط ہو جائیں تو ایک عذاب ہیں، مگر انہیں
 از خود اختیار کر لیا جائے تو سرسرا سکون و الطینان ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے
 اپنی امت کے لیے فقر و تنگدستی کا اندیشہ محسوس نہیں کیا بلکہ خوش بگیری اور مرفہ الحالی
 کو دین کے لیے فتنہ قرار دیا، آپ برابر لوگوں کو قال اور حال سے فقر اختیار کرنے کی
 تلقین فرماتے رہے، اپنا یہ عالم تھا کہ ہفتہ ہفتہ چولہا ٹھنڈا رہتا، صاحبزادی کے ہاتھوں
 میں کام کی کثرت کے باعث آبلے پڑ گئے مگر غلام عطا کرنے کے معاملے میں بدر کے
 قیموں کو ترجیح دی، خود قاتلے سے میں مگر کوشش رہی کہ کوئی سائل دروازے سے
 خالی نہ جانے پائے، اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کی ارواح مقدسہ بھی فقر اختیاری کے
 قالب میں ڈھل گئی تھیں اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا ان کا شعا
 بن گیا تھا۔ سارا دن روزے سے رہے مگر افطار کے وقت جب لقمہ منہ میں ڈالنے والے
 تھکے چاہک سائل کی صدا گونجی، لقمہ ہلک گیا اور حاضر سائل کو پیش کر دیا، اور پھر افسوس
 و سحر کے وہی روزہ دوسرے دن کسی قیم کی ضرورت مقدم رکھی گئی، تیسرے دن قیدی
 کی حاجت پوری کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یہ سب واقعات فقر اختیاری کے عمدہ نمونے
 ہیں۔ تصوف میں اس فقر کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے، صوفیاء کرام نے اپنی پوری
 زندگی میں ہمیشہ تمول و تعیش پر فقر کو ترجیح دی، لیکن یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ
 فقر صرف ترک دنیا و مال کا نام ہے اور اپنے نفس کو خواہ مخواہ دکھ میں رکھنا مقصود
 ہے بلکہ فقر دراصل دل کے غنا کا نام ہے۔ حقیقی فقیر تب بنتا ہے جب اس کے لیے
 دنیا و اسباب دنیا کا ہونا نہ ہونا برابر ہو، چنانچہ اس ضمن میں حضرت داتا گنج بخش
 کا یہ فرمان ایک خاص اہمیت کا حامل ہے: "فقیر کی اصل متاع دنیا کا ترک اور اس
 سے علیمدگی نہیں بلکہ دل کو اس کی محبت سے خالی اور بے نیاز کرنا ہے، فقر وہ ہوتا ہے

جو متاع دنیا سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس کے پاس خواہ سرے سے کچھ موجود نہ ہو۔ یا اس کے پاس دنیا کے سارے اسباب موجود ہوں دونوں میں سے کسی حالت میں کوئی نخل نہ آئے نہ کسی چیز کے مفقود ہونے پر اسے پریشانی لاحق ہو اور نہ جملہ اسباب موجود ہونے پر وہ اپنے آپ کو دولت مند محسوس کرے۔ ۱۷

اگر تعمق نظر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فقر کچھ مل جانے پر شکر اور نہ ملنے پر صبر کا نام ہے، نہ تو تنگدستی اور مفلسی فقر پر اثر انداز ہوتی ہے اور نہ خوش بستی اور اور صرفہ الحالی، کیونکہ فقر اسباب کے مفقود ہونے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا براہ راست رابطہ دل کے ساتھ ہے چنانچہ اس ضمن میں حضرت شیخ علی الجویری داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو فقر اور مصیبت کی حالت میں کمال صبر کے باعث ”نعم العبد“ قرار دیا اور حضرت سلیمانؑ کو شکر نعمت کی بدولت ”نعم العبد“ فرمایا اور یا صبر ایوبؑ اور شکر سلیمانؑ دونوں بارگاہ الہی میں یکساں ہیں۔ ۱۸

اس سلسلے میں ضیاء الدین سروردی کی رائے بہت ہی دقیق اور مفید ہے فرماتے ہیں۔
”فقر فاقہ کرنے یا کچھ نہ رکھنے کا نام نہیں بلکہ فقر محمود یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ رکھے اور جو کچھ خدا دے اس پر راضی رہے۔ ۱۹

یہی وہ خدا کی رضا پر راضی ہونا ہے جسے بجا طور پر غنا“ (بے نیازی) کہا جاسکتا ہے جیسا کہ شیخ ابوبکر کتانیؒ فرماتے ہیں۔

”جب انسان حقیقی طور پر اللہ ہی کا محتاج ہو جاتا ہے تو پھر وہ حقیقی طور پر ”غنی باللہ“ ہو جاتا ہے۔ ۲۰

جب انسان فقر اختیار کر لیتا ہے تو داریں کے دھندوں اور گھمیلوں سے نجات

پالیتا ہے اور زندگی میں جو سکھ اور چین اسے نصیب ہو گیا ہے اسے بادشاہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوتا، شیخ ابوبکر وراق نے بڑی دل فلتی اور خوبصورت بات کہی ہے فرماتے ہیں،

”دنیا اور آخرت دونوں جہان میں فقیر کے لیے خوشخبری ہے، لوگوں نے جب پوچھی تو فرمایا، اس لیے کہ دنیا میں بادشاہ اس سے خرچ نہیں لیتا آخرت میں خدا حساب نہیں مانگے گا۔“

فقیر اس اعتبار سے لائق تحسین ہے کہ اس کے اور اللہ کے مابین تعلق میں کبھی خلل واقع نہیں ہوتا اور تقرب کی کیفیات میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ دو چیزیں ہی ایسی ہیں جو اس تعلق و تقرب میں خلل انداز ہوتی ہیں، نعمت مل جانے پر غرور ہونا اور چمن جانے پر شکوہ کرنا، فقیر کے ہاں ان دونوں کا گزیر نہیں ہوتا، کچھ نہ ملے تو وہ سکون محسوس کرتا ہے مل جائے تو اپنے لیے کچھ نہیں رکھتا جیسے کہ شیخ ابوالحسین نورانی فقیر کی تعریف میں کہتے ہیں۔

”جب اس کے پاس کچھ نہ ہو تو اسے سکون حاصل ہوا اور جب کچھ مل جائے تو خرچ کر دے۔“

مال و اسباب کے موجود و مفقود ہونے کی دونوں حالتوں میں فقیر کی نگاہ کاہرگز ذات خداوندی ہوتی ہے، فقیر کو لاکھوں کر دروں مل جائیں تو وہ اپنے دل کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا ہے اُسے اپنے دل کے کسی گوشے میں غیر معمولی خوشی اور خدا نے غفلت کی کوئی رمت نظر نہیں آتی اگر اس سے تن کے کپڑے بھی چھین لیے جائیں تو اپنا چہرہ گھور گھور کر دیکھتا ہے مگر اس پر بے چینی اور شکایت کا اثر دور دور تک بھی دکھائی نہیں دیتا، حضرت داماد گنج بخشؒ نے شیخ ابوالقاسم قشیریؒ کے بارے میں لکھا ہے:-

”میرے استاد قشیریؒ نے فرمایا مجھے اگر خداوند تعالیٰ غنی کرے تو میں

غافل ہونے کے بجائے اس کا شکر ادا کروں گا اور اگر وہ مجھے فقیر بنا دے
تو حریص اور متنبہ ہونے والا بننے کے بجائے صبر کروں گا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ فقیر دراصل دنیا میں دل کے نہ اٹکنے اور
کھینے کا نام ہے، اس حقیقت کو شیخ ابو بکر شبلیؒ نے ان الفاظ کا روپ دیا ہے "فقر الی
اللہ کی ادنیٰ علامت یہ ہے اگر اس کے پاس ساری دنیا ہو اور پھر وہ اسے ایک دن
میں خرچ کر ڈالے اور اس کے بعد اگر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ وہ ایک دن کی
خوراک رکھ لیتا (تو بہتر ہوتا) تو یہ فقر نہیں"۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ جس نے دنیا سے منہ موڑا اس کے قدموں پر دنیا ڈھیر ہوئی
جس نے لوگوں سے الگ تھلک رہنے کا سوچا۔ لوگوں کا ازدحام اس کی جانب دوڑا،
جس نے فقر کو تو نگری بہ ترجیح دی، تو نگری نے اس کے قدم چومے، بڑی بعیرت افزوز
بات کہی ہے، جناب علی مرتضیٰ نے کہ دنیا سائے کی مانند ہے پیٹھ دے کر چلو تو خود بخود
پہچھے آئے گی، اسی باعث حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو کھنا پڑا۔

"ہم نے فقر مانگا تو مال داری نے ہمارا استقبال کیا، لوگوں نے مال داری
مانگی تو فقر (محتاجی) نے اُن کا استقبال کیا"۔

اس بحث کے خاتمے پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کی مستند کتابوں سے
کچھ ایسے مختصر اور چند واقعات نقل کر دیے جائیں جس سے آسانی پتہ چل سکے کہ فقیر حجب
گڈرمی اور ہر گز مٹھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کیا محسوس کرتا اور کہاں موجود پاتا ہے،
فقیر الی اللہ حجب دنیا سے "غنی" بن کر فرشِ خاک پر بیٹھتا ہے تو وہ خود کو سدرہ نشین
تصور کرتا ہے، ہاتھ خالی ہونے کے باوجود دولتِ دنیا کو پاؤں کی ٹھوکریں سمیٹتا ہے اس
کی آنکھ سیر، اس کا ذہن مطمئن اور اس کا دل غنی ہوتا ہے، فاقوں پر فاقے مہموں تو سانس
کبھی گھٹتی محسوس نہیں ہوتی، نہ دوا ہر قدموں پر نچاؤ ہوں تو دل کی دھڑکن کبھی تیز نہیں

ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ یہ دلی پوشی، بے چہروں اور بکھرے بالوں والے، شامان
 بے تاج اور خسروان بے کلاه ہوتے ہیں۔ جب گلدی بہن لیتے ہیں تو دنیا بائیں اور
 آخرت دائیں بغل میں ہوتی ہے۔ اُن کی شان قلندری، تاج سکندری کو ترچی نگاہ کہہ
 مستحق نہیں جانتی، ان کی فقیری، کوہین کی امیری کو برکاہ کی حیثیت نہیں دیتی، ایسا کیوں
 نہ ہو، یہ لوگ خدا کے فقیر جو ہوئے، آدمی بے نظیر کیوں نہ ٹھہریں، اب آئیے اس
 واقعات کی طرف جو ایک طرف بعیرت افزائی تو دوسری جانب وجدان فرائی اور ذوق
 افزا بھی جن کے ایک ایک شوشے سے غیرت فقیر چھلکی پڑتی ہے۔ شیخ ابو القاسم
 قشیری رقمطراز ہیں:-

شیخ ابو علی دقانؒ کے پاس ایک فقیر آیا جس نے ٹاٹ کا کرتہ اور ٹاٹ
 کی ٹوپ پی بہن رکھی تھی، ساتھیوں میں سے ایک نے تعریف طبع کے طور
 پر کہا یہ ٹاٹ کتنے میں خریدا ہے؟ فقیر نے جواب دیا: دنیا دے کر خریدا
 ہے۔ اور بیچنے والے نے مجھ سے کہا اسے پھر میرے پاس رکھ دو۔ اور
 آخرت لے لو مگر میں نے نہیں بچا۔ تلہ

ملاحظہ فرمائیں ٹاٹ کے گرتے اور ٹوپ کی قیمت! عہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

دنیا اگر فقیر خدا مست کے قدموں میں ہوتی ہے تو پیش نظر آخرت بھی نہیں ہوتی
 بلکہ اُسے پس پشت رکھا جاتا ہے اُن کی نگاہ تو صرف مالک دنیا و مالک یوم الدین پر پڑتی
 ہے۔

امام ابو بکر اسحاق کلا باذی لکھتے ہیں:-

شیخ ابو الحسن دراجؒ نے سرمہ دانی کی تلاش میں اپنے استاد کے برتن کو ٹٹولا
 تو اس میں چاندی کا ایک ٹکڑا پایا، فرماتے ہیں۔ مجھے اس پر سخت حیرت

marfat.com

Marfat.com

ہوئی، جب استاد آئے تو میں نے عرض کیا، آپ کے برتن میں مجھے چاندی کا ایک ٹکڑا ملا ہے، انہوں نے فرمایا تم نے دیکھ لیا ہے؟ اسے وہیں رکھ دو، پھر کہا اسے تم لے لو اور اس سے کچھ خرید لو، اس پر میں نے کہا۔ آپ کو اپنے معبود کی قسم! اس ٹکڑے کا کیا تقصد ہے؟ فرمایا اللہ نے اس کے سوا کوئی اور سونے اور چاندی کا ٹکڑا انہیں دیا تو میں نے چاہا میں وصیت کروں کہ اسے میرے کفن کے ساتھ باندھ دیا جائے تاکہ میں اسے اللہ کو واپس کر دوں۔ لکھو

یہ رہی ان کی غیرت فقر!

یہ لوگ اپنی شان و آن فقر کی کس قدر حفاظت کرتے تھے، اور انہوں نے کس طرح فقر کو اپنا اور حنا بھوتا بنایا تھا اور ان کا قال و حال کیوں کر فقر کا نمونہ تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

مشیخ ابو محمد حسینؒ فرماتے ہیں میں نے شیخ احمد بن محمد الجلاءؒ سے فقر کے متعلق سوال کیا۔ آپ خاموش رہے لوگ اٹھ کر چلے گئے، پھر آپ اپنی جگہ پر جا کر تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور فرمایا: میرے پاس چار دانگ (پارہم) تھے اس لیے مجھے اللہ سے شرم آئی کہ میں فقر کی بات کروں۔ فقر کے بارہ میں مندرجہ صدر تشریحات و توضیحات کے بعد ان میں کوئی ایسی چیز ہے جسے ہدفِ طعن بنایا جاسکے بلکہ یہ صفات اگر پوری امت اپنا لے تو اس کے لیے دوبارہ اپنا کھوپڑا مقام و وقار بحال کرنے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی یہی وہ فقر ہے جو تصوف کی تعلیمات میں فیلادی اہمیت کا حامل اور صوفیاء کا طرۃ امتیاز و امتداد ہے۔

توبہ

جب ہم تصوف کی مستند اور اہم کتب کا مطالعہ کرتے اور صوفیاء کرام کی مجالس و محافل کے بارے میں پڑھتے ہیں، تو وہاں 'توبہ' کی تلقین و تعلیم کا بکثرت ذکر ملتا ہے، بلکہ صوفیاء کرام کے ہاں خصوصی تقرب حاصل کرنے کا طریقہ ہی یہ تھا کہ انسان تمام الائنشوں سے مصفیٰ، تمام لغزشوں سے معزا، تمام فروگزاشتوں سے مبترا اور تمام گناہوں سے تائب ہو کر ان کی خدمت میں پہنچے، توبہ کا صوفیاء کے ہاں کیا مقام و مرتبہ ہے اور کتنی اہمیت و فضیلت ہے، اس کا اندازہ شیخ عبداللہ انصاریؒ کی تحریر کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

توبہ راستے کا نشان، باریابی کی راہ نما، خزانے کی کلید، وصال محبوب کی شفیق، عظیم وسیلہ، قبولیت کی شرط اور تمام مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے توبہ کے بارے میں جو خاکہ اُبھرتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ انسان، جہالت و نادانی کی بنیاد پر گناہ کر بیٹھے، پھر اسے اپنے گناہ کا شدید احساس ہو، بعد ازاں وہ فوراً اس کی تلافی کر دے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

انما التوبۃ علی اللہ للذین یعملون السوء بیہالۃ ثم یتوبون
من قریب فادلک یتوب اللہ علیہم وکان اللہ علیہم حکماً۔

توبہ جن کا قبول کرتا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو
جہالت سے کوئی گناہ کر بیٹھے ہیں، پھر فی الفور توبہ کر لیتے ہیں سو ایسوں
کی خدا تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ علیم حکیم ہے۔

اس سے اگلی آیت میں گناہ پر اصرار کرنے اور اسی حالت میں مر جانے والوں
کی توبہ قبول نہ کرنے کا ذکر ہے، گویا توبہ کے تین عناصر ترکیبی ہیں۔ احساس و اعتراف
جرم، تلافی و مافات اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم بالجزم، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک
اور مقام پر تصریح کے ساتھ آیا ہے۔

ثُمَّ ان رُبَّكَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ
ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوا، اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے جہالت سے بُرا کام
کیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور (آئندہ کے لیے) اپنے اعمال درست
کر لیے تو آپ کا رب اس کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت
کرنے والا ہے،

ان دونوں آیات کو بیک وقت سامنے کر لیا ملاحظہ فرمائیے تو بہ کا مکمل
اور حقیقی مفہوم سامنے آتا ہے، توبہ کے بارے میں امام غزالیؒ نے اپنی شہرہ آفاق
اور قابل فخر کتاب کیمیائے سعادت اور منهاج العابدین میں مفصل بحث کی ہے جس
میں کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا، تفصیل کے طالب ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں۔
احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی توبہ کی تفصیل اور تائب کی عظمت پر
خاصہ زور دیا گیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک ہی حدیث اپنے مدعا کو واضح کرنے
کے لیے کافی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے توبہ کرنے سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے اگر تم میں سے کسی کی لق و دق صحرا میں سواری گم ہو جائے جس پر اس کا کھانا پینا ہو اور وہ اس سے ناامید ہو جائے اور وہ ایک درخت کے سائے کے نیچے ناامید ہو کر موت کے انتظار میں سو رہا تو اس نے اچانک اپنی سواری کو دیکھا کہ اس کے نزدیک کھڑی ہے، اس کی سار پہکار خوشی سے کہنے لگا یا الہی تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں خوشی کی وجہ سے (آدابِ مراتب) بھول گیا ۱۰۴

قرآن مجید اور حدیث سے توبہ کی فضیلت اس کے طریقہ اور قبولیت کی شرائط کا بخوبی پتہ چل گیا، اب اس ضمن میں اہل تصوف کی آراء دیکھنی چاہئیں، کہ وہ توبہ کا کیا مفہوم لیتے ہیں؟ اور ان کے ہاں توبہ کا مرتبہ کیا ہے؟ قرآن مجید کی دو مندرجہ صدر آیات میں سے جو توبہ کا مفہوم نکلتا ہے اسے ذہن میں رکھیے اور شیخ عبداللہ انصاری کی رائے ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے کس عمدگی سے قرآن مجید کے مفہوم کی ترجمانی کی ہے کہتے ہیں:-

”توبہ کے تین ارکان ہیں، دل میں نادم ہونا، زبان پر معذرت کا اظہار بدی اور بدول سے انقطاع“ ۱۰۵

توبہ کیا ہے؟ شیخ جنید بن محمد فرماتے ہیں:-

”گناہ کا بھول جانا توبہ ہے“ ۱۰۶

شیخ ابو بکر بن ابواسحاق کلاباذی شیخ جنید کے قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”جنید کے قول کے معنی یہ ہیں کہ تو اس فعل کی لذت کو اپنے دل سے

اس طرح نکال دے کہ تمہارے باطن پر اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔

توبہ کیوں کی جائے اور کیوں ضروری ہے؟ صوفیاء کے ہاں اس کی مختلف

وجوہات ہیں، خدا کا خوف، خدا سے حیا، ثواب کا طمع، خدا کی قربت کا احساس
 حکم کی پابندی وغیرہم، لیکن آراء و افکار کے اختلاف کے باوجود روح سب کی ایک
 ہے، شیخ مغازیؒ سے جب توبہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: "توبۃ الانابہ" کے
 بارے میں پوچھ رہے ہو یا "توبۃ الاستجابہ" کے متعلق۔ سائل نے کہا: "توبۃ الانابہ" کیا ہے
 فرمایا تجھے اللہ کا ڈر اس لیے رہے کہ وہ تم پر قادر ہے، سائل نے کہا پھر توبۃ الاستجابہ
 کیا ہے؟ فرمایا تو اللہ سے اس لیے حیا کرتا رہے کہ وہ تیرے قریب ہے۔ "۔
 شیخ ابو علی دقاقؒ نے توبہ کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

"توبہ، انابہ، اوبہ، جو سزا کے خوف سے کی جائے وہ توبہ ہے،
 جو ثواب کی خاطر کی جائے وہ انابہ ہے اور جو حکم کی پابندی کو ملحوظ رکھ
 کر کی جائے وہ اوبہ ہے۔"۔

امام غزالیؒ نے توبہ کی جامع مگر مختصر اور دلنشین تعریف کی ہے لکھتے ہیں:-
 "دل کا گناہ سے پاک ہو جانا توبہ ہے۔"۔

توبہ کرنے سے پہلے اور توبہ کرنے کے بعد کی حالت میں کیا نمایاں فرق ہونا چاہیے
 اس کی تشریح بڑے خوبصورت پیرائے میں شیخ ابراہیم دقاقؒ نے فرمائی ہے
 شیخ ابوبکر بن ابواسحاق کلاباذلیؒ آپ کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

"توبہ یہ ہے کہ جس طرح تو پہلے اللہ کی طرف پشت کیے ہوئے
 تھا اور ادھر توجہ نہیں دیتا تھا اب تو ہمہ تن توجہ بن جائے اور اس کی
 طرف پشت نہ کرے۔"۔

ہم پہلے شیخ عبداللہ انصاریؒ کے حوالے سے لکھ آئے ہیں کہ توبہ تمام
 مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ کیسے ہے اور کیوں ہے؟ اس کا پتہ لگانے کے لیے
 توبہ سے پہلے کی کیفیت معلوم کی جائے تاکہ مسرتوں کے سرچشمہ کی حقیقت واضح

ہو سکے۔ شیخ ذوالنون مصریؒ توبہ سے پہلے کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچے ہیں۔
 "زمین باوجود اپنی فراخی کے تمہارے لیے اس قدر تنگ محسوس ہو کہ
 تمہیں چین نہ آئے بلکہ تمہارا نفس تمہارے لیے تنگ ہو جائے۔" لفظ
 شیخ بوشنجیؒ نے جنید بن محمدؒ کی توبہ کی تعریف کے بارے میں تائید کی ہے اور
 دونوں بزرگوں کا نقطہ نظر ایک ہے، یعنی گناہ کا بھول جانا اور اس کی لذت کا اثر
 ذائل ہو جانا، بوشنجیؒ فرماتے ہیں:-

"جب تو گناہ کا ذکر کرے اور تجھے اس کے ذکر سے اس کی مٹھاس محسوس
 نہ ہو تو یہی توبہ ہے۔" گ

شیخ ابو حفصؒ سے دریافت کیا گیا توبہ کرنے والا دنیا سے بغض کیوں رکھتا ہے؟
 فرمایا اس لیے کہ دنیا وہ گھر ہے جہاں اس نے گناہ کیا ہے، سائل نے پھر پوچھا، دنیا
 وہ گھر بھی تو ہے جہاں اسے توبہ کا موقع ملا، تو فرمایا اسے اپنے گناہ کا تو قطعی علم ہے مگر
 قبول توبہ کے متعلق اسے کھٹکا ہے۔ گ

یہ ہیں وہ اقوال صوفیاء جو ہمیں تصوف کی معتبر اور مستند کتابوں میں ملتے ہیں جن
 میں توبہ کی فضیلت، توبہ کے عمرکات، قبولیت کی شرائط، تائب کی توبہ سے پہلے اور بعد
 کی کیفیات کا ذکر ہے، انہیں پرہیز کرکون یہ کہہ سکتا ہے کہ صوفیاء کی تعلیم و تبلیغ قرآن
 و سنت سے مختلف ہے؛ بلکہ جو باتیں اصول و قواعد کے طور پر قرآن و حدیث میں بیان
 ہوئی ہیں، اہل تصوف نے ان میں مزید کشمکش اور تاثیر پیدا کر دی ہے، ان کے حسن
 بیان اور اچھوتے انداز تعبیر نے ان باتوں کو عام ذہن کے قریب اور دل کو ان سے
 مانوس کر دیا ہے، اب اگلے صفحات میں ہم "تعمومی" پر گفتگو کریں گے۔

تقویٰ

تقویٰ قرآن و سنت کی ایک جامع اصطلاح ہے اور اس کے سببی اور ایجابی دو پہلو ہیں، نافرمانی سے بچنا اور احکام خداوندی کی حفاظت و رعایت کرنا، اسلام میں از اول تا آخر جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہی تقویٰ ہے، حصول ہدایت قبولیت اعمال، معیت خداوندی، محبوبیت کاملہ، دنیوی و اخروی فلاح، سب تقویٰ پر منحصر ہے، اسلام کے تمام ارکان و شعائر میں اسی تقویٰ کی جلوہ آرائی اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسی کی کار فرمائی ہے، روزہ کی غایت روح تقویٰ کی بیداری ہے۔ قربانی کا اصل مقصد تقویٰ ہے، مسجد کی عمارت میں تقویٰ بطور بنیاد شامل ہے، حج اور شعائر اللہ کے احترام میں تقویٰ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اسلام

۱۔ (یہ قرآن) تقویٰ والوں کو راہ دکھاتا ہے (البقرہ: ۲) ۲۔ اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے (المائدہ: ۲۷) ۳۔ اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے (البقرہ: ۱۹۴) ۴۔ تو اللہ بے شک اہل تقویٰ سے محبت کرتا ہے (التوبہ: ۴) ۵۔ بلاشبہ تقویٰ والوں کے لیے کامیابی ہے (بنہ: ۳۱) ۶۔ تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر تاکہ تم متقی بن جاؤ (البقرہ: ۱۸۳) ۷۔ خدا کے پاس قربانی کا گوشت مدفون نہیں ہوتا لیکن تم اللہ تقویٰ اس کو پہنچاؤ (الحج: ۳۷) ۸۔ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم ہے (التوبہ: ۱۰۸) ۹۔ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے (الحج: ۳۲)

کا نظام اخلاق تقویٰ سے عبارت ہے اور اسلام کا نظام عدل تقویٰ پر مشتمل ہے معاشرے میں باہمی تعاون کی اساس تقویٰ ہی کو قرار دیا گیا ہے، نظام تعزیرات کی غرض تقویٰ ہے، تقویٰ فی الحقیقت حدود کے اندر رہنے اور ان کی حدود لائن پابندی اور رعایت کا نام ہے، یہ تقویٰ جہاں ہیں عالم انفس میں نظر آتا ہے، وہاں عالم آفاق میں بھی محسوس ہوتا ہے، دریاہوں یا سرسبز و شاداب گل بوٹے، ہر کہیں تقویٰ کا نظارہ کیا جاسکتا ہے جانوروں تک میں اس کے اثرات ہیں، شیر کا گھاس اور بکری کا گوشت نہ کھانا یہ فطرت کی حدود میں پابند رہنا (تقویٰ) ہے، کھاری اور سیٹھے سمندروں کا ٹکڑا نا مگر باہم نہ ملنا بھی وہی حدود کی رعایت موجود ہے، سورج کا چاند کو نہ جا ملنا اور پانی کا لٹیب کی طرف ہمیشہ بہنا تقویٰ کی عید اور عملی تفسیر ہے، انبیاء کرام کی تعلیمات میں تقویٰ سر فہرست نظر آتا ہے، نیز اللہ کے نزدیک کسی کا عزیز و کریم ہونا اسی تقویٰ کے باعث ہے، تقویٰ تین چیزوں کو جنم دیتا ہے، خدا کی موجودگی کا احساس، خدا کے حضور حاضر ہونے کا خوف اور رب تعالیٰ کے غضبناک ہونے کا ڈر، یہ تین چیزیں انسانی سیرت کا لازمہ بن جائیں تو اندرونی و بیرونی دشمن یعنی نفس امارہ اور شیطان لعین پر باسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔ تقویٰ کی ساری بحث کالباب اور خلاصہ یہی ہے کہ حدود شرعیہ کی پابندی پورے اخلاص اور صدق دلی کے ساتھ کی جائے، قرآن مجید نے ایک مقام پر واضح انداز میں حدود کی پابندی کو تقویٰ کہا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

تَعَادَلُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَادَلُوا عَلَى الْاَثَرِ وَالْعَدْوَانِ

۱۔ اہم تمام امانات کو دینا تقویٰ کے قریب ہے (البقرہ: ۲۳۷) ۲۔ انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے (المائدہ: ۸) ۳۔ تعاون کر دینا تقویٰ کی بنیاد پر (المائدہ: ۲) ۴۔ تمہارے لیے بدلہ میں نہ ملے گی ہے اسے عقل والو! کہ تم تقویٰ اٹھائیں جاؤ (البقرہ: ۱۷۹)

marfat.com

Marfat.com

دائم نیکی اور تقویٰ کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کرونا کہ گناہ اور سرکشی پر
یہاں تقویٰ کو عدوان کے مقابلہ میں لایا گیا ہے اور عدوان کا مفہوم حد سے تجاوز
کرنا ہے، یعنی حد سے نکل جانا عدوان اور حد کے اندر رہنا تقویٰ ہے، بنا و بریں فیخ ابو
عثمان مغربی فرماتے ہیں،

”تقویٰ یہی ہے کہ بندہ حدود کے اندر رہے نہ کوتاہی کرے نہ تجاوز کرے“
تقویٰ کے بارہ میں اس عام تاثر کی کوئی دلیل قرآن و سنت میں نہیں ملتی جو معاشر
میں رائج اور قائم ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ہر وہ شخص
ستقی ہے جو اپنی زندگی کے ہر گوشے میں فرائض و واجبات اور مامورات و منہیات کا
احترام کرے ہر اس کام کو پورے جوش و خروش سے کرے جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے
اور ہر اس کام سے رک جائے جس سے روکا گیا ہے، تقویٰ کی بحث میں اس امر کا خیال
بھی ضروری ہے کہ تقویٰ کا زیادہ تر تعلق کثرت سے نہیں کیفیت سے ہے، اعمال و
اشغال کی کثرت سے تقویٰ پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ تو خالصتاً دل کا فعل ہے، دل کی یہی
آمادگی و اخلاص معمولی عمل کو اللہ کے نزدیک غیر معمولی بنا دیتے ہیں، ایک انسان ترک
دنیا کر کے حدود اللہ کو فراموش کرنے کا مرتکب ہو سکتا ہے اور دوسرا شخص امور دنیا
میں مشغول و منہمک ہو کر بھی حدود اللہ کی رعایت با حسن طریق کر سکتا ہے، خلوت و
خلوت میں اللہ کے حدود کی پابندی کا اہتمام تقویٰ ہے۔

شیخ بہاد الدین نقشبند فرماتے ہیں، میں زندگی میں دو مرتبہ سخت حیران ہوا،
ایک شخص کو کعبہ کے طواف کے دوران خدا سے غافل پایا تو بہت حیران ہوا مگر اس
سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی، جب بخارا کے تاجر کو کپڑا بیچتے وقت یاد خدا میں
مصرف پایا۔

بعض لوگوں نے صرف کثرتِ نوافل اور اوراد و وظائف میں حد درجہ دلچسپی و انہماک

کو تقویٰ کا اصلی کام قرار دے دیا ہے اور اس کے علاوہ دین کے جتنے اہم اور عظیم کام ہیں، ان سے بے رحمانہ پس منظر میں مٹی گئی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ تقویٰ جس کا اصل مقصد توازن و اعتدال ہے، خود توازن کے دائرے سے نکل کر بے اعتدالی کی راہ پر چلا گیا، تقویٰ کی زبان میں ہم اس مسئلہ کو یوں سمجھ سکتے ہیں، بقول شیخ ابوالحسن سیروانیؒ: "صوفی اور اوستہ نہیں واردات سے ہوتا ہے۔ جس حد تک عبادات کو قرآن و سنت جائز اور مناسب قرار دیتے ہیں، ان کی ادائیگی اور حزم و احتیاط یہ روح تقویٰ ہے، ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کو بڑی خوبصورتی سے واضح فرمایا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس تین جماعتیں آپ کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں، جب ان کو آپ کی عبادت کا پورا پورا حال بتایا گیا تو کچھ ایسا ظاہر ہوا کہ ان کی نظر میں بہت کم ہے، پھر وہ بولے ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ؟ آپ کو تو انگلی اور پچھلی خطائیں نہ ہونے کے باوجود معاف کر دی گئی ہیں، پھر ان میں سے ایک شخص بولا میں ہمیشہ رات بھر عبادت کروں گا، دوسرا بولا میں ہمیشہ روزے رکھوں گا، تیسرے نے کہا میں عورتوں سے بالکل قطع تعلق کروں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا، استغنیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگئے، آپ نے فرمایا تم لوگ یہ یہ کہہ رہے تھے، خدا کی قسم میں تم سے کہیں زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس سے تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں لیکن اس کے باوجود روزے بھی رکھتا ہوں، نغہ بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں آرام بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جس نے میری طریقہ سے انحراف کیا وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

یہ حدیث بذاتِ خود اپنی تشریح آپ ہے، تقویٰ کے مفہوم میں جہاں یہ بات شامل ہے کہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے وہاں اس امر کا بھی اہتمام ملتا ہے کہ حتی الوسع حرم و احتیاط سے کام لیا جائے، یعنی جس مقام سے معصیت کی حد شروع ہوتی ہے عین اسی مقام کے آخری کناروں پر گھومنا آدمی کے لیے خطرناک ہے، یہی معنوں ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بادشاہ کی ایک حمی (وہ چراگاہ جہے کوئی بادشاہ رعایا کے لیے ممنوع قرار دے دیتا ہے، ہوتی ہے اور اللہ کی حمی اس کی وہ حدیں ہیں جن سے اس نے حرام و حلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے جو جانور حمی کے گرد چرتا رہے گا، ہو سکتا ہے کہ ایک روز وہ حمی کے اندر داخل ہو جائے۔

اسی حدیث کی صدائے بازگشت امیر عمر رضی اللہ عنہ کا وہ قول ہے جسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے نقل فرمایا ہے: ہم (محل شبیر میں) حلال کی دس چیزوں میں سے نو حرام میں پڑ جانے کے خوف سے چھوڑ دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے تقویٰ کے بارہ میں پوچھا گیا، آپ نے سائل سے فرمایا: اگر تم ایسی راہ سے گزر رہے ہو جس کے دائیں یا بائیں خاردار جھاڑیاں ہیں تو کیسے گزرو گے؟ جواب دیا میں اپنے کپڑے سمیٹ لوں گا، فرمایا یہی حرم و احتیاط، تقویٰ ہے۔ اس بات کی تائید ہمیں اہل تصوف کے ہاں سے ملتی ہے، شیخ ذوالنون مصریؒ نے پوچھا گیا، بندے کے لیے خوف کی راہ کب آسان ہوتی ہے؟ فرمایا جب وہ اپنے آپ کو بمنزلہ بیمار سمجھے تو وہ اس ڈر سے کہ میں بیماری طول نہ پکڑ جائے، ہر چیز سے پرہیز کرتا ہے۔

تقویٰ کی تعریف، مفہوم اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد

ہم صوفیاء کرام کے ان اقوال پر نظر ڈالتے ہیں جو ہمیں اس موضوع پر ملتے ہیں، تقویٰ میں خوف ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہے، حدود اللہ کی پابندی کے اصل محرکات کیا ہیں، اس کے بعد ایمانی اور سلبی پہلو ہیں، نافرمانی کے باعث درجات میں کمی اور عذاب میں ابتلاؤں اس لیے صوفیاء کرام نے اپنے پیروکاروں میں زیادہ سے زیادہ خدا کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر یہ چیز پیدا ہو جائے تو مصیبت و عذاب سے ایک گونہ وحشت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے، بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن پر معاشرہ حد یا تعزیر نافذ کر سکتا ہے مگر بعض گناہ وہ ہیں جن پر گرفت کی صورت ممکن نہیں مثلاً حسد، بغض، کینہ، ریاد وغیرہم ان پر صرف اپنے اندر خوف خدا پیدا کر کے قابو پایا جا سکتا ہے، یہ چیز احساس و ادراک کی اصلاح سے ہوتی ہے کیونکہ احساس و ادراک پر کسی قسم کا کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کی ساری کوششوں کا محور و مرکز انسان کا احساس و ادراک رہا، وہ جانتے تھے کہ تمام نیکیوں اور برائیوں کا سوتا یہی ہے، اسی لیے اس کی درستی میں پورے جسمانی بلکہ معاشرتی نظام کی درستی ضرور ہے، ایک شخص اگر گناہ کا ارادہ کرتا ہے مگر یہ خیال آتے ہی رک جاتا ہے جس کا رذق کھاتا ہوں اس کی نافرمانی کتنی بڑی احسان فراموشی ہے تو بس یہی خیال تقویٰ بن جاتا ہے، اگر گناہ سے اس لیے باز آ جاتا ہے کہ خدا ہر کہیں موجود ہے اس کی موجودگی میں اس کی نافرمانی کتنا بڑا اور سنگین جرم ہے، تو یہی احساس تقویٰ بن جاتا ہے، اگر گناہ سے اس لیے پہلو تہی کی کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جو خدا کی حدود مملکت سے باہر ہو فلہذا اس کی مملکت میں اس کی نافرمانی گویا خود موت کو دعوت دینا ہے تو یہی سوچ تقویٰ بن جاتی ہے، اگر گناہ سے کتارہ کشی کا سبب یہ امر بن جاتا ہے کہ خواہ کہیں اور کسی حال میں گناہ کروں، قیامت کے دن اس کی باز پرس سے نہیں بچ سکوں گا تو بس اسی کا نام تقویٰ ہے، صوفیاء کرام کے نزدیک خدا کا خوف ہی گناہ کے مقابلے میں ڈھال کا کام

دیتا ہے، اس لیے ان کے سوا عطا اور ان کی مجالس و محافل میں زیادہ تر گفتگو خوف الہی اور خشیت خداوندی کے موضوع پر ملتی ہے، اور وہ یہ سمجھتے تھے اور سمجھتے بھی تھے کہ بجانب خدا کا خوف ہی وہ تازیانہ ہے جو انسان کو ہر وقت متنبہ اور خبردار رکھتا ہے اور کبھی غفلت کے گڑھے میں نہیں گر سکتا، بنا بریں خواجہ حسن بھری سے پوچھا گیا "ان لوگوں کی مجلس کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے جو ڈراڈرا کر ہمارے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کیے دیتے ہیں، ارشاد فرمایا، ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنا جو تمہیں آج ڈرا کر کل کے خوف سے نجات دلا دیں ان لوگوں کی صحبت سے بہتر ہے جو آج تمہیں بے خوفی کا درس دے کر کل دردناک خوف میں مبتلا کر دیں۔"

صوفیاء کرام کے ہاں کسی بھی مقام پر خدا سے بے خوفی کی اجازت نہیں، وہ ہر لمحے خود احتسابی کا سبق دینے میں مشغول رہتے تھے اور چونکہ رہنے کی تعلیم کرتے رہتے تھے، ان کے ہاں کوئی شخص، کوئی مقام اور کوئی معاملہ ایسا نہیں جسے کر کے انسان یہ محسوس کرے کہ اب میں معصیت و نافرمانی سے بالکل محفوظ ہو گیا ہوں، بلکہ اسے ہر وقت ان دیکھے خوف میں مبتلا رہنا چاہیے، خبر نہیں کسی وقت پاؤں پھسلے اور عمر بھر کی کمائی اکارت چلی جائے، حضرت عاتق اعظمؑ فرماتے ہیں تو کسی نیک جگہ پر دھوکا نہ کھا کیونکہ جنت سے بڑا کر کوئی نیک جگہ نہیں ہو سکتی، پھر بھی اس میں حضرت آدم علیہ السلام پر جو گزری سو گزری نہ کثرت عبادت پر غرور کر، کیونکہ ابلیس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی اس قدر طویل عبادت کے بعد ہوا، صالحین کی صحبت و دیدار پر بھی بھروسہ نہ کر کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کر کس کی شان ہو سکتی ہے، مگر آپ کے شہد دل آپ کے دیدار سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔"

خوف و تقویٰ اختیار کرنے کے ضمن میں نہ صرف شیطان پر نظر رکھنا کافی ہے کہ کہیں کوئی اوجھا دار کر کے چپ نہ گرا دے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ اپنے نفس کی

نگرانی ضروری ہے جو نکور ہاتھ میں لیے بغیر لڑتا ہے، خارجی دشمن سے یہ داخلی دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہے، اندر سے پیدا ہونے والی بیماری باہر کے لگے زخم سے زیادہ تشویشناک ہوتی ہے اس لیے حضرت ابو عمرو دمشقیؒ نے متقی اور خائف کی تعریف میں فرمایا:-

خائف وہ شخص ہے جو اپنے نفس سے اپنے دشمن (شیطان) کی نسبت زیادہ خوف کھاتا ہو۔

خوف و تقویٰ کی اقسام بیان کرتے ہوئے امام غزالیؒ لکھتے ہیں:-

شہوت سے باز رہنا عفت، حرام سے دور رہنا ورع اور مشتبہ حلال سے رکنا تقویٰ ہے۔

خوف و خشیت کے بار بار تذکرہ سے یہ غلط فہمی ہرگز پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ انسان ہر وقت بیدار کی طرح لڑتا ہے، اس کی آنکھوں کے کنارے ہمہ وقت تر رہیں، آواز میں خاص قسم کی رقت آجائے، لب و لہجہ میں مسکینی ٹپکتی محسوس ہو، وضع قطع سے کسی مستقل بیماری کا شائبہ ابھرتا ہو اور چہرہ مہرہ کسی ترسناک مایوسی میں لپٹا لگنا دے بلکہ خوف و خشیت کا جو مفہوم قرآن و سنت میں کیا ہے، یعنی منہیات و منکرات سے پرہیز بعینہ وہی کچھ ہمیں صوفیاء و کرام کی تعلیمات میں ملتا ہے اس کو امام ابو القاسم قشیریؒ لکھتے ہیں:-

”خائف اسے نہیں کہتے جو رو رہا ہو اور اپنی آنکھیں پونچھتا ہو، بلکہ خائف تو اسے کہیں گے جو اس چیز کو جس پر اسے عذاب کا ڈر ہے ترک کر دے۔“

اب ہم آخر میں چند ایسے ایمان افروز اور رقت انگیز واقعات نقل کریں گے جن سے پتہ چلتا ہے کہ خوف خدا کتنے والے لوگ کس طرح اپنے نفس کا ماسہ جاری رکھتے ہیں۔

حضرت احنف بن قیسؒ کا کہنا ہے کہ میرے دل میں گناہ کا خیال ابھرا میں نے اپنی

انگلی جلتے دیے پر لہ دی اور کہا نفس تو ایک چراغ کی آگ تو سہ نہیں سکتا جہنم کی آگ کو کیسے برداشت کرے گا اور اس طرح میرے سہ سے گناہ کا خیال یکدم محو ہو گیا، انہی کا واقعہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا خیال آیا اپنی عمر کا اندازہ لگایا تو ساٹھ برس نکلی اور اکیس ہزار پانچ دن بنے، اللہ — ایک دن میں ایک گناہ کا صدور فرض کر لیا جو آپ کے خیال میں کم سے کم تھایوں اکیس ہزار اور پانچ گناہ سرزد ہوئے، یہ سوچنا تھا کہ غش کھا کر گرے اللہ بے ہوش ہو گئے نہ شیخ جنید بغدادیؒ کے حقیقی ماموں اور مرشد طریقت شیخ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

میں روزانہ اپنے چہرے پر نظر ڈال کر دیکھتا ہوں کہ کہیں مدھیہ تو نہیں ہو گیا ہوں۔

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی روایت کے مطابق شیخ سری سقطیؒ نے متعدد بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بغداد کے علاوہ کسی اور شہر میں مرنے چاہتا ہوں، پوچھا گیا، کیوں فرمایا مجھے ڈر ہے کہیں میری قبر مجھے قبول نہ کرے تو رسوائی ہو جاؤں۔^{۱۵} سچ ہے خدا کا خوف ہو تو کوئی پل غفلت میں نہیں گذر سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دل میں خوف خدا ہو تو بڑے سے بڑے حملہ آور کو اس قلعہ میں محفوظ رکھنا کام لایا جاسکتا ہے۔ بھاری سے بھاری ہتھیل کو اس ڈھال پر گند کیا جاسکتا ہے اور مہلک سے مہلک زہر کے لیے اس سے تریاق کا کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ شیخ عبد اللہ انصاری فرماتے ہیں،

خوف اللہ ایمان کا قلعہ، ہوا و ہوس کے لیے تریاق اور مومن کا ہتھیار ہے۔^{۱۶}

اخلاص

اسلام میں تمام اعمال کا دار و مدار اخلاص پر ہے، وہ عمل نہیں جس میں اخلاص نہ ہو، زندگی بھر کی عبادت اس وقت اکارت ہو جاتی ہے جب اس میں اخلاص نہ ہے انسانوں کے تعلقات بھی اگر اخلاص پر استوار ہوں تو پائیدار رہتے ہیں تو آخر بندے کا خدا کے ساتھ تعلق اخلاص کے بغیر کیسے قائم رہ سکتا ہے، انبیاء کرام نے آغازِ کار ہی میں واضح کر دیا حَاشَکُمْ عَلَیْہِ اِجْرًا اِنْ اُجْرَیْ اِلَّا عَلٰی اللّٰہِ (میں تم سے کوئی حق اللہ مت نہیں لوں گا میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے، قرآن مجید ریاکارانہ عمل کو منافقین کا فعل قرار دیتا ہے، کوئی شخص اگر دکھاوے کو مال خرچ کرے تو وہ کسی اجر و ثواب کا مستحق نہیں ہوتا۔ قرآن مجید اس کے اس عبث فعل کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے،

ترجمہ: جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر، اس کے خرچ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک چٹان تھیں جس پر مٹی کی تہہ جھی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔

حدیث میں وارد ہے، جو شخص دکھانے کو نماز پڑھے مشرک ہے۔ جو شخص دکھاوے کا روزہ رکھے وہ مشرک کا مرتکب مٹرتا ہے اور جس

نے لوگوں کو دکھانے کے لیے صدقہ و یادہ بھی مشترک ہے۔ ۱۸۶

الغرض دین خلوص اور اخلاص کا دوسرا نام ہے، جس میں اخلاص نہیں اس میں دین نہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہو یا صدقہ، جہاد ان سب کی بنیاد اخلاص نہیں تو کچھ بھی نہیں، شیطان کے کارگرداؤں میں سرپرست یہی داؤ ہے کہ انسان کو رحمان کے معاملے میں اخلاص سے محروم کر دے اور نتیجے کے طور پر نماز محض ڈھونڈ بن کر رہ جائے، روزہ بغیر بھوک پیاس برداشت کرنے کے کلیثہ بے ثمر رہے، زکوٰۃ صرف تاوان ہی سمجھی جائے اور حج سفر اور سفر کی کلفتوں کا مجموعہ بن جائے، جہاد و لوشجاعت دینے کا ذریعہ اور صدقہ شہرت کا وسیلہ،

تجربہ شاہد ہے کہ وہ بولٹا آگ ہی نہیں سکتا جسے پانی نہ ملے بعینہ وہ عبادت نتیجہ خیز نہ ہو ہی نہیں سکتی جس کی بنیاد اخلاص نہ ہو، حضرت علیؑ فرماتے ہیں: **ما اهللہ عبادتہ من خلقک ولا طمعاً فی جنتک ولكن وجد تک اهللاً لعبادۃ نعبد تک**

یا الہی میں جہنم کے ڈر یا جنت کے طمع میں تیری عبادت نہیں کرتا بلکہ تو عبادت کا مستحق ہے اس لیے تیری عبادت کرتا ہوں۔ یہ ہے اخلاص کی عمدہ مثال۔
صوفیاء کرام نے بھی ہمیشہ اسی اخلاص کو لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کی تھوون نے جب اپنے کام کا آغاز کیا تو یہ نہ تھا کہ نماز پڑھنے والے اور روزہ رکھنے والے لوگ نہ تھے، سب کچھ تھا لیکن محض عرفا اور رسما، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

کن مع اللہ صلات لا خلق وکن مع الخلق کان لا نفس
خدا کے ساتھ بغیر مخلوق اور مخلوق کے ساتھ بغیر نفس کے معاملہ کر۔

یعنی عبادات مخلوق کی خوشنودی کے بغیر مومن اور معاملات نفس کی خواہش کے علی الرغم، اخلاص پر مبنی ہوں۔

شیخ عبداللہ الفارسی الہرویؒ اخلاص کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱۰ اخلاص کی تین قسمیں ہیں، اخلاص شہادت وہ اسلام میں ہے، اخلاص خدمت وہ ایمان میں ہے، اخلاص معرفت وہ حقیقت میں ہے اخلاص شہادت کے تین گواہ ہیں، اللہ کی عبادت میں مخلوق کو نہ دیکھنا یعنی ریاست پر مہیزار کا رحق میں سنت مطہرہ کی پاسداری اور اطاعت الہی میں حلاوت پانا، اور اخلاص معرفت کے بھی تین گواہ ہیں۔ وہ خوف جو گناہ سے روکنے والا ہو، وہ امید جو طاعت پر ثابت قدم رکھے وہ محبت جو حکم الہی کے ساتھ موافقت رکھنے والی ہو۔ لکھ

علم پر نازاں اور زہدان خشک ہمیشہ خود بینی کے مرض میں مبتلا رہے ہیں، مگر صوفیہ کرام نے اپنے دائرہ اثر میں خود شکنی کو رواج دیا کیوں کہ اخلاص کا یہی تقاضہ ہے۔

ابو محمد رویم البنادی فرماتے ہیں :-

”اخلاص یہ ہے کہ تو اپنے عمل کو دیکھنا چھوڑ دے۔“

انسانیت کے ماتھے پر بدترین داغ یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن میں مطابقت نہ ہو، زبان پر ”عشق“ کا دعویٰ مگر دل میں ”فسق“ بھرا ہوا ہو۔ ماتھے پر بظاہر عبادت کے باعث سیاہ رنگ کا محراب ہو لیکن دل پر اس سے بھی زیادہ سیاہ نقطہ ہو، انسان کی جلوت رحمانی مگر خلوت شیطانی ہو، دیکھنے میں انسان اور پرکھنے پر حیوان ثابت ہو، دن خشک گزریں اور راتیں تر بسر ہوں، اسی بے آہنگی اور عدم مطابقت کو صوفیاء نے ہم آہنگی اور یکسانیت میں بدلنے کی کوشش کی، حذیفہ مرعشی فرماتے ہیں۔

”اخلاص یہ ہے کہ بندے کے ظاہر و باطن میں یکسانیت ہو۔“

ذوالنون مصریؒ اخلاص کی علامات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”خلاص کی تین نشانیاں ہیں، عوام کی مدح یا مذمت بندے کے نزدیک
یکساں ہو، اعمال میں اپنے اعمال کو دیکھتا بھول جائے، آخرت میں اپنے
صلہ کا بے قراری سے منتظر نہ ہو۔“

خلاص عمل کے ضمن میں عمدہ ترین تشریح شیخ ابو یعقوب سوسی نے کی ہے۔
فرماتے ہیں:-

”خلاص عمل وہ ہے جس کا فرشتوں تک کو پتہ نہ ہو، کہ ملکہ سکلیں اور نہ
شیطان کو خبر ہو کہ لگاڑ سکے اور نہ ہی نفس کو علم ہو کہ اس پر فخر کر سکے۔
کسی بھی کام کو نفس خوشنودی رب اور رضا اللہ کے لیے کرنا اگرچہ کمٹن
ہے لیکن خلاص کا مرتبہ یونہی نہیں مل جاتا، اس کے لیے بہر کیف نفس اور خواہشات
نفس کو قربان کرنا پڑتا ہے، اس امر کا ہر ایک کو احساس ہے کہ جب نفس کو لذات و
خلوط سے محروم رکھا جاتا ہے تو وہ زخمی و زردے کی طرح پلٹ پلٹ کر حملے کرتا ہے
غرائی اور جھپٹتا ہے، مگر منزلِ خلاص جانے کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے، نفس کے
لیے ہر وہ عمل گراں ہوتا ہے، جس کا محرک خلاص ہو یا کیوں ہوتا ہے، سہل بن
عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں:-

”در یافت کیا گیا نفس پر کونسی چیز گراں ہے؟ فرمایا خلاص! کیوں کہ
اس میں نفس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔“

اب ہم آئندہ میں علی بن الموفقؒ المتوفی ۲۶۵ھ کی مناجات کا ایک حصہ
یہاں پیش کرتے ہیں جس سے یہ سمجھے میں آسانی ہو جائے گی کہ اربابِ تصوف اپنے
ہر عمل کو خلاص کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتے تھے بلکہ یوں کہیں کہ کوئی عمل خدا
کے حضور پیش بھی کیا جاسکتا ہے جو کھوٹا اور آلودہ ہو، رب العزت کے حضور عرض
پر داز ہیں۔

میرے مولا! اگر تو یہ جانتا ہے کہ میں تیری عبادت تیری بنائی ہوئی جہنم کے
خوف سے کرتا ہوں تو تو مجھے اس کا ایندھن بنا دے، اگر تو جانتا ہے کہ میں تیری عبادت
جنت کے طمع میں کرتا ہوں تو تو مجھے اس سے یکسر محروم کر دے اور اگر تو جانتا ہے کہ میری
عبادت صرف تیرے شوق ویدار میں ہے تو پھر تیرا جو جی چاہے میرے ساتھ سلوک کر۔
یہ اخلاص کی معراج اور نقطہ کمال کی بہترین مثال ہے جو اس مناجات سے ہمارے
سامنے آتی ہے، گویا ان کے نزدیک شوق جنت اور خوف جہنم بھی ایک آلائش ہے
جس سے عمل کو آلودہ نہ ہونے دیا جائے، ان کی نظر میں طمع دینا کا ہو یا آخرت کا
بہر حال طمع ہی ہے اور طمع ہوتے ہوئے اخلاص امر محال ہے۔

صبر

صبر ہمت سے اہم ترین اخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقت میں یہ وہ ”شکلید“ ہے جس سے مصیبت کا ہر قفل کھل جاتا ہے یہ دنیا پر فوراً جہاں سے منزل صاف طور پر دکھائی دینے لگتی ہے یہ وہ مشعل ہے جسے ہاتھ میں تھام کر راہ کے ہر روڑے، ٹھوکر اور کھائی سے بچا سکتا ہے، صبر کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتا، نیکی کے راستے پر چلنے میں اگر کوئی دشواری محسوس ہو رہی ہو تو قرآن مجید اس دشواری کا علاج صبر بتاتا ہے: ”وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ“

صبر دراصل روکنے اور باندھنے کو کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی کھچکی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب و ضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر بدستور بڑھتا چلا جائے، اگر راہِ حق کا راہی انسان صبر کو اپنا زورِ راہ بنا کر چل دے تو وہ کسی نقصان یا مصیبت سے ہمت نہیں ہارتا، کسی ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتا، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتا اور کسی بھی حالت میں راستی اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، قرآن مجید میں بار بار صبر اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے کبھی طاعت پر، کبھی بیماری اور تکلیف میں، کبھی راہِ حق میں اور کبھی دشمن کے مقابلے پر، العرض جہاں بھی ڈولنے یا پھسلنے کا خطرہ ہو وہاں صبر ہی قدم میں ثبات

یاد کرتا ہے۔
 آزمائش کے مراحل کے لیے اس کی ضرورت قرآن مجید نے یوں بیان کی ہے۔
 ”مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم! اہل کتاب اور مشرکین سے بہت تکلیف دہ باتیں سنو گے اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے مصلے کا کام ہے۔“ (آل عمران ۱۸۶)

تنگی مصیبت اور جنگ کے وقت قرآن مجید صبر کا حکم دیتا ہے۔
 ”اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ
 میں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔“
 حق و باطل کی کشمکش کے دوران صبر کی اہمیت قرآن مجید کی روشنی میں،
 ”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ
 نے یہ نو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جائیں
 رطانے ولے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔“
 دشمنوں کے شر سے بچاؤ کے لیے قرآن مجید کون سا کارگر ہتھیار فراہم کرتا ہے
 ملاحظہ ہو۔

”اگر تم صبر اور خدا ترسی اختیار کرو تو تمہارے دشمنوں کی کوئی تدبیر تمہارے
 خلاف کامیاب نہیں ہو سکتی۔“
 قرآن مجید کے بعد احادیث بھی صبر کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتی ہیں
 ۔ بیوں مقامات ایسے ہیں، جہاں صبر کے فضائل، خوشگوار نتائج اور بہترین ثمرات
 کا ذکر ملتا ہے۔

قرآن مجید کی تصریحات کے علاوہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ کی سیرتیں

صبر و استقامت کا مرقع تھیں اور صبران کی کتاب زندگی کا عنوان اقل تھا۔ صوفیاء کرام نے بھی اپنی تعلیمات میں صبر کو نمایاں جگہ دی ہے، یوں کہا جائے تو غالباً غلط نہ ہو گا کہ صوفیاء کرام کی زندگی میں جو توکل، استقلال، ایثار، جفاکشی، سادگی اور مداومتِ عمل کی کیفیات پائی جاتی ہیں، یہ صبر کی مختلف صورتیں ہیں، کیونکہ تمام امور بخوشی اللہ کے سپرد کر دینا کمال درجے کا صبر ہی تو ہے، دنیوی موانع اور نفسانی مزاحمتوں کے مقابلے میں مستقل مزاجی صبر ہی ہے، تعمیش اور تنعم کی زندگی کو خیر باد کہہ کر جفاکشی کی راہ اپنانا بھی صبر ہے، دنیا کی زیب و زینت سے صرف نظر کرتے ہوئے سادگی کی روش اختیار کرنا صبر نہیں تو کیا ہے؟ اپنا سب کچھ دوسروں کے لیے وقف کر دینا صبر ہی کی ایک شکل ہے، ماحول کی ناسازی اور شیطان کی وسوسہ اندازی کے علی الرغم اپنا کام کیے جانا صبر کی عمدہ مثال ہے، غرض صبر کو صوفیاء نے اپنا اور دنیا بھڑنا بنالیا تھا، تصوف کے لٹریچر میں صبر کے سلسلے میں متعدد باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں مگر ان سب کی روح اور غایت ایک ہی ہے، شیخ عبداللہ انصاری صبر کے تین ارکان بتاتے ہیں۔

”معیبت پر صبر کرنا کا قال اللہ، صبر و اصیبت پر صبر کرنا یعنی رک جانا، کا قال اللہ صابر و اطاعت پر صبر کرنا کا قال اللہ، رالبطو، ۵۵ امام ابو بکر محمد بن اسحاق کلابادی صبر کے متعلق رقمطراز ہیں۔

”صبر یہ ہے کہ تو صبر کے اندر بھی صبر کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تو صبر کرتے ہوئے بار بار یہ نہ دیکھے کہ بلا کب ملتی ہے اور کب کشائش ہوتی ہے؟ حضرت جنید بغدادیؒ سے استفسار کیا گیا کہ صبر کسے کہتے ہیں؟ فرمایا۔

”ناک بھوں جو اچھے بغیر کڑوی چیز کا گھونٹ پی جانا صبر ہے“

امام ابوالقاسم القشیریؒ حضرت ابراہیم خواصؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

کتاب و سنت کے احکام پر ثابت قدم رہنا صبر ہے ۱۰
 صبر کا بالعموم یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ انسان صرف تنگی اور مصیبت کے وقت
 جزع و فزع نہ کرے، لیکن صوفیاء کی تعریحات سے جس طرح معلوم ہوا ہے وہ اسے
 ایک وسیع معنی اور مفہوم میں لیتے ہیں۔ شیخ محمد حسن مجددی فاروقی فرماتے ہیں۔
 "صبر دو قسم ہے، ایک ان میں دوسرے سے افضل ہے، ایک مصیبتوں
 میں صبر کرنا ہے، یہ بھی اچھا ہے لیکن اس سے افضل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ
 کی کل حرام کی ہوئی چیزوں سے کیا جائے" ۱۱

صوفیاء کرام کی ان تعلیمات کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے اندر ضبط نفس، حدود
 کی رعایت، ثبات قدمی استقامت اور مستقل مزاجی کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں
 اسلام بھی تو اپنے پیروکاروں کے اندر یہ صفات پیدا کرنا چاہتا ہے، صبر ظلم سنے اور
 چپ رہنے کا کام نہیں، طاقتور کے مقابلے میں عاجزی کو صبر نہیں کہتے، صبر سراسر
 انضباط نفس ہے اور اسکا اظہار موقع و محل کے مطابق ہوتا رہتا ہے۔

فتوت

یہ درحقیقت قیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے دوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

آج کے مادہ پرستانہ اور خود غرضانہ ماحول میں جس قدر اس تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے، شاید گذشتہ دور میں کبھی محسوس کی گئی ہو، آج ہوا دھوس کا دور دورہ من و تو کا بھگڑا، مفادات کا چرچا، میرا حق، میرا مال، میرا کاروبار، کا غلغلہ اور کچھ "لو اور کچھ دو" کا نعرہ ہر سو گونج رہا ہے، انسان روٹی، پیٹ، نفس، مال، ازدواج، دولت، مفاد، اور خواہش کا بندہ بن کر رہ گیا ہے، دل ہے کہ ان کے علاوہ کچھ سمجھتا ہی نہیں، دماغ ہے کہ بحز ان کے کچھ سوچتا ہی نہیں، زبان ہے کہ اس کے سوا بالوتی ہی نہیں کان ہیں کہ ان کے بغیر کچھ سنتی ہی نہیں، آنکھ ہے کہ ان سے ہٹ کر کچھ دیکھتی ہی نہیں اللہ قیامت سے پہلے قیامت کا سماں اور حشر سے پہلے حشر برپا ہے ایثار، قربانی، فتوت، تزیج، سخاوت تو بھولی بسری باتیں ہو کر رہ گئی ہیں اب تو عدل انصاف، مساوات، برابری، تقسیم جیسی اصطلاحات بھی آثار قدیمہ بنتی چلی جا رہی ہیں ہر طرف "میں ہی میں" اور "میرا ہی میرا" کا شور برپا ہے، اس سب کچھ میرا کے فلسفے کو ہونے کا لانے کے لیے ہمسایوں کے حقوق تلف کیے جاتے ہیں، کسی بیوہ کے

سر سے دوڑا جاتا ہے، کسی قیم کا آخری سارا چھینا جاتا ہے، ایمان و ضمیر کا سودا کیا جاتا ہے، قانون کو با مال کیا جاتا ہے، انصاف خریدا جاتا ہے، انسانیت کھلی جاتی ہے، خون بہایا جاتا ہے، غرض سب کچھ کیا جاتا ہے، آج اس تحفظ ذات اور مفاد خویش نے انسان کے دل سے رحم اور آنکھوں سے حیا کو ختم کر دیا ہے، رشتوں کو تقدس اور دوستی کو خلوص سے عاری کر دیا ہے۔

ظہر ہو جس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انسان کو اسلام نے حق طلبی پر فرض شناسی کو ترجیح دی ہے، لذت کیشی پر آرام رسانی کو فوقیت دی ہے، اسلام انسان کو سوداگر، تاجر یا پیشہ ور نہیں حضرت انسان دیکھتا چاہتا ہے جس کے پہلو میں پتھر نہیں دھڑکتا دل ہو، دل میں جذبات کا سمندر موجزن ہو، آنکھوں میں سروت کی لکیریں ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی دوسروں کو آرام بہم پہنچانے میں گزری، برابر کا حق وصول کرنا کو نسا کمال ہے، دوسروں کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو جانا اصل مقام انسانیت ہے، پھول کے بدلے پھول تو رسم دنیا ہے، پتھر کے جواب میں پھول برسانا معراج آدمیت ہے، ”بھلا کر بھلا ہوگا“ تو فقیروں کی صدا ہے، مردان خدا سب کا بھلا مانگتے ہیں، انصار مدینہ کے دیگر اوصاف کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ نے ان کے ایشار و قربانی کے وصف کو سراہا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ الْغَنِيِّمْ وَلَا تَكُنْ مِمَّنْ يَتَّبِعُونَ
اور اپنے اور پر تنگی ہی کیوں نہ ہو انہیں اپنے سے مقدم رکھتے ہیں۔
تفاوت کا سارا دار و مدار ترک خویش پر ہے، صوفیاء نے ”کے معنوم ہی سی واقف نہیں وہ تو دینے کے عادی رہے، انہیں ”مخدوم“ نہیں ”خادم“ بننے میں خوشی ہوتی تھی، انہیں حقیقی راحت دوسروں کی راحت پہنچا کر ہوتی تھی، سرمایہ دارانہ

جیسے بے رحم نظام کی ناکامی کے بعد سوشلزم اور کمیونزم جیسے بے جوڑ اور غیر فطری نظام کا مقابلہ آج اگر ہو سکتا ہے تو اسی فتوت اور ایثار کی تعلیم کو اس کی روح کے ساتھ عام کرنے سے ہو سکتا ہے، اعلیٰ اہمیتی، جوان مردی، بلند ظرفی، سیرت شہی، صیادلی، اور فراخوصلگی کا تعلق اسی فتوت اور ایثار سے ہے، آج جو پرلے درجے کی خست، حرص، خود غرضی، ہوس پرستی، اور تنگدلی پیدا ہو چکی ہے، اس کا توڑ یہی فتوت اور ایثار کا جذبہ ہے۔

صوفیاء کرام نے اسے اپنے ہاں کتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ انکی کتابوں کے مختلف اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

امام ابوالقاسم القشیریؒ نے مختلف صوفیاء کے اقوال کے ذریعے اس کی تشریح و توضیح کی ہے۔

امام ابوالقاسم قشیریؒ خود ہی فرماتے ہیں۔

”فتوت دراصل یہ ہے کہ انسان ہمیشہ دوسرے کے کاموں میں لگا رہے۔“
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے شیخ ابوعلی دقاقؒ فرماتے ہیں:-

”یہ ایسا کمال ہے جو کما حقہ آپ کو حاصل ہے، قیامت میں ہر شخص

”نفسی نفسی“ اور آپ ”امتی امتی“ فرمائیں گے۔“

انہی شیخ ابوعلی دقاقؒ سے پوچھا گیا فتوت کیا ہے؟

”انسان اس بات میں قطعاً اقلید نہ کرے کہ اس کے ہاں ولی کھانا کھا رہا ہے یا کافر؟“

موجودہ دور میں خولیش پروردی اور اقربانوازی کے مرض کا علاج بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے جو ادھر شیخ دقاقؒ نے تجویز فرمایا کہ انسان فیض رسانی میں اپنے اور

پرائے کی تمیز سے بالا ہو جائے، ایک اور مقام پر شیخ فرماتے ہیں۔
فتوت یہ ہے کہ تو دس آدمیوں کو دعوت دے تو فوراً گیارہ آجائیں تو تجھ
میں ناراضگی پیدا نہ ہو۔

اسی ضمن میں شیخ ابوالقاسم قشیریؒ نے ایک عبرت آموز اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے
جہاں فتوت اپنے نقطہ سرودج پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے، یہ ایک ملاقات کا قصہ ہے جو امام
جعفر صادقؑ اور شفیق بلخیؒ کے درمیان ہوئی۔

شفیق بلخیؒ نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا فتوت کسے کہتے ہیں؟ آپ نے
فرمایا تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا تو وجدنا شکرنا (اگر کچھ مل
جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں)، اور لو فقدنا صبرنا (اگر نہیں ملتا تو بیٹھ
رہتے ہیں)، آپ نے فرمایا، ہمارے ہاں مرینہ میں کتوں کا یہی شیوہ
ہے کہ کچھ مل جاتا ہے تو کھالیتے ہیں نہیں ملتا تو چپ ہو رہتے ہیں، شفیق
بلخیؒ نے پوچھا آپ فتوت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ فرمایا لو فقدنا
شعرنا (اگر کچھ نہیں ملتا تو شکر کرتے ہیں)، اور لو وجدنا اثرنا (اگر مل
جاتا ہے تو ایثار کر دیتے ہیں)،

اسی سلسلے کی ایک سنہری کڑی کے طور پر محمد بن الفضلؒ کا قول ملاحظہ فرمائیے
زاہد اور مردود کا فرق بیان کرتے ہیں۔

زاہد اس وقت ایثار کرتے ہیں جب غنی ہوں اور حواں مردوں کا ایثار
تبہ ہوتا ہے جب خود عاجز ہوں۔

متذکرہ صدر اقوال اور تعلیمات بلاشبہ ایک انسان کو بے لوث، خلوص کا پیکر
ایثار کا پتلا اور دریادل بنانے میں کافی مددگار معاون ثابت ہو سکتی ہیں، اگر ان
باتوں کو عام رواج دیا جائے اور انہیں بار بار ذہن نشین کرایا جائے تو اس سے

انسان کچھ غمخواری میں نہ بھجیب بیٹھ کر زندگی گزارنے والا، ترک و تہجد کا متوالا، عافیت
 کوش اور حجرہ نشین بنتا ہے یا سراپا عمل بن کر میدان میں نکل آتا ہے اور خدا کے
 حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق ادا کرنے میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے
 بس یہی تصوف ہے اور کچھ بھی نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسے تصوف پر کوئی شخص
 کم از کم بقائمی ہوش و خواہش اعتراض نہیں کر سکتا :

اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

شیخ جامی فرماتے ہیں :-

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیس دولت از گفتار خیزد

حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی سیرت پر کردار گفتار دونوں اثر انداز ہوتے ہیں، بات تیر بن کر دل میں کھب جاتی ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہو۔ گفتگو اگر حکمت سے لبریز ہٹھاس سے معمور، دل دردمند کی ترجمان اور حسن بیان سے بھرپور ہو تو ایک ایک حرف اپنا اثر چھوڑتا ہے، صحابہ کرام کی کردار سازی میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال ایمان اور ذکاوت کا اثر تھا وہاں آپ کے بیان فیض ترجمان کی تاثیر کا بھی خاصہ حصہ تھا، چھوٹی چھوٹی مگر حکمت و موعظت سے لبریز باتیں، تاثیر، کشش اور کیف میں رچے بھلے، اور معارف و حقائق کے خزینے دامن میں لیے ہوئے مختصر اقوال بلاشبہ صحابہ کرام کی سیرتوں پر بے پناہ اثرات مرتب کرتے تھے، اُن سے جہاں ایمان تازہ ہوتا وہاں عرفان کو بھی غذا ملتی، ایک طرف اگر عقل کی گتھیاں سلجھ رہی ہوں تو دوسری جانب ذوق و وجدان کی پرورش بھی ہوتی رہتی، گفتار کی شیرینی اور بیان کی جلاوت مخلوق میں اترتی محسوس ہوتی اور دل کی دنیا جذب و شوق سے معمور ہو جاتی۔ جب ہم صوفیاء کرام کی مجالس و محافل کے بارے میں کچھ پڑھتے اور ان کے ملفوظات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی محفل و مجلس ایسا چمنستان نظر آتی ہے جس میں ہر گل اپنا

رنگ اور اپنی ہلک رکھتا ہے، جس کا رنگ آنکھوں کو سرور بخشتا اور خوشبو شام جان کو مسطر رکھتی ہے، جب بزرگوں کی مٹھلیں عروج پر پہنچیں تو دلکش مثالوں اور حکایتوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے عمیق ترین حقائق جنگلیوں میں حل ہوتے جاتے۔ مٹھل پر کبھی جذب جنون طاری ہوتا کبھی عقل و خرد کی جلوہ آرائی، کبھی ایمان و عرفان کی اور کبھی جنت کی شاہدوں کا ذکر اور کبھی جہنم کی وادیوں کا تذکرہ، مٹھل میں رحمت و شفقت حق کا ذکر آتا تو ہرے تبتا لٹھتے، عذاب و عتاب کی بات سبلیتی تو آنسوؤں کی بھڑیاں لگ جاتیں، احترام انسانیت کا موضوع پھر آتا تو موتی لٹھتے۔ تعلیم آدمیت کا مسئلہ آتا تو دریا بہتے، خدا کے عدل پر لب کشائی ہوتی تو چٹخیں نکل جاتیں، اس کے فضل پر زبان کھلتی تو باچھیں کھل جاتیں، غیرت فقر کا مضمون نوک زبان ہوتا تو بوریہ نشین ظاہر خرقہ پوشوں کے سر میں سکندر کا دماغ آجاتا خدمت خلق کی بحث نطق آشنا ہوتی تو پندار و ناموس کے آہنگینے چھنا کے سے ٹوٹ جاتے، "مع اللہ" کا تصور پیش ہوتا تو درمیان میں سے مخلوق نکل جاتی "مع المخلوق" پر اظہار خیال ہوتا تو نفس غائب ہو جاتا، صوفیاء کرام کی باتیں ایجاز و اختصار کا بہترین مرقع ہوتی تھیں، قطرے میں دریا اور ذرے میں مہر کو انہوں نے سمو کر دکھایا، صوفیاء کرام کی مجلسوں میں اپنوں اور غیروں کی یکجائی کا عجیب سماں نظر آتا، نہ کسی پر تنقید نہ کسی پر تعریف، گفتگو میں نہ مناظرانہ پن اور نہ کسی کی لازاری کا شائبہ، بات دہی کسی جو ہر ایک کے دل کی تھی، دل سے نکلی دل پر بیٹھی، چلہ کھینچنے سے پیلے کعب گئی، کوئی دیران دل لے کر میٹھا، آباد دل لے کر اٹھا، خالی ہاتھ پہنچا دامن بھر کر گیا، تھکا ماندہ آیا، ہشاش بشاش رخصت ہوا، صوفیاء کی مجلس گویا صحرا کے پیادہ پا مسافروں کے لیے گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی تھی،

صوفیاء کس دلنشین انداز میں لوگوں کی اصلاح تربیت کرتے تھے، ان کے ہاں بیٹھنے والے کس قسم کے انسان بن کر نکلتے ہوں گے اور محافل و مجالس کیسی ایمان

افروز ہوتی ہوں گی، جہاں احترامِ انسانیت، خوفِ خدا، خدمتِ خلق، محنت، تقویٰ، اخلاص، عجز و نیاز، ایثار، توکل اور حسنِ اخلاق کے چرچے ہوتے تھے، ایسی ہی پسند معائن کی جھکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

دہلی میں خانوادہٴ چشت کے ممتاز رہنما کا دربار بجا ہے، بڑے چھوٹے، ایک ہی مجلس میں برتری اور کمتری کے احساس سے بالا ہو کر بیٹھے ہیں، ستاروں کے اس ہالے میں خواجہ نظام الدین دہلوی چاند بن کر محفلِ آرا میں اور فرما رہے ہیں :-
 "ایک شخص نے خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی خدمت میں چھری پیش کی، فرمایا مجھے چھری نہ دو، مجھے سوئی لا دو۔ میں کاٹنا نہیں چاہتا
 آیا ہوں۔" بلے

یہ ہے "برائے وصل کردن آدمی" کی تفسیر
 "علم و عمل کے باہم لازم و ملزوم ہونے اور ان کی اہمیت و ضرورت کتنی ہے
 اسے شیخ بہاد الدین نقشبندؒ نے کس خوبصورتی سے واضح کیا، مجلس کی ایک
 جھلک اور گفتگو کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے۔

"تو شمع کی طرح بن، تو شمع کی طرح نہ بن، شمع کی طرح بن یاں معنی
 کہ دوسرے کو روشنی پہنچائے اور شمع کی طرح نہ بن یاں معنی کہ تو
 خود تاریکی میں رہے۔" ملے

توکل اور توکل کی روح کیا ہے؟ حضرت ابو بکر شبلیؒ فرماتے ہیں :-
 "ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کثیر العیال ہونے کی شکایت
 کی، فرمایا ان انسداد کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ کے ذمہ
 نہیں۔" ملے

عجیب و غریب افعال کے صدور اور خرقِ عادت واقعات کے ظہور ہی کو

صرت کرامت سمجھا جاتا ہے اور اسے عام ذہن معیار ولایت قرار دیتے ہیں مگر اس
المجہد کو شیخ بہاء الدین نقشبندؒ نے بڑے حسن کارانہ انداز میں سلجھایا ہے، لوگوں نے
آپ سے کرامت طلب کی تو فرمایا:-

”یہی کرامت کیا کم ہے کہ اتنے گناہوں کے باوجود ہم روئے زمین پر
چل پھر رہے ہیں۔“

صوفیاء کے ہاں خود بینی کے بجائے خود نکستی کا رواج زیادہ ہوتا ہے، پھر پوچھ لو پھرے نسبت کی بہ
نسبت: بیچ میرزی کا چلن عام ہے، اس ضمن میں خواجہ نظام الدین دہلویؒ کی مجلس کا
ایک گوشہ پیش نظر رکھیے، آپ فرما رہے ہیں:-

”جسے دیکھو اسے اپنے سے بہتر سمجھو اگرچہ تم اطاعت گزار ہو اور وہ
گنہ گار ہو، ہو سکتا ہے کہ یہ تمہاری آخری الامت اور اسکا آخری گناہ ہو، تم
گنہ گار بن جاؤ لہذا تم کو کار بن جائے۔“

شعلہ و شبنم کی کیمانی، آتش شوق اور باران اشک کی ہم آغوشی جیسی مجازی کیفیت
کو حقیقت کا روپ شیخ ابوبکر شبلیؒ نے کیسے دیا، ملاحظہ ہو،
آپ مجلس میں صدر نشین تھے، قریب ہی گیلی لکڑیاں جل رہی تھیں ایک طرف
آگ تھی، دوسرے سرے سے پانی رس رہا تھا، آپ حاضرین مجلس کی طرف متوجہ
ہوئے، فرمایا:-

”اگر یہ بات سچ ہے کہ تمہارے دل آتش شوق میں جل رہے ہیں تو
تمہاری آنکھوں میں آنسو رواں کیوں نہیں ہوتے؟“

لوگ نہ جانے عقل و دولت کسے کہتے ہیں، اس کی کیا نشانی ہے؟ اس مسئلہ
میں شیخ ابوعلی محمد بن عبدالوہابؒ کا نقطہ نظر نصیحت آموز بھی ہے اور بصیرت افروز
بھی، فرماتے ہیں:-

”اُف ہے دنیا کے کاموں پر جب وہ اُمڈ کر آجائیں اصاف ہے دنیا کی حسرتوں پر جب وہ جاتی رہیں، عقلندہ ایسی چیز کی طرف ہرگز توجہ نہیں دیتا، کہ آئے تو مشغولیت کا سبب ہو اور جلنے تو حسرت کا۔“
 غیبت زنا سے سخت، مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف، مگر اخلاقی پستی کی انتہا لیکن یہ سب کچھ بدگوئی میں شامل ہے، مگر بدخواہی، شیخ نظام الدین ادویہ فرماتے ہیں:-

”بڑا کٹا بڑا ہے مگر بڑا چاہتا اس سے بھی بدتر ہے۔“
 اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرو: یہ قرآن مجید کا حکم ہے کتنا خرچ کرو؟ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شرح مقرر کر دی، رہے صدقات نافلہ ان کی صرف ترغیب ملتی ہے، مگر اس اہم ترین مسئلہ کو جس نے پوری دنیا کا سکون تلپٹ اور دماغ پھاٹ رکھا ہے، صوفیاء کرام کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ حضرت ابو بکر قبلی کا رنگ ملاحظہ ہو، پوچھنے والے نے پوچھا:-

”زکواہ کب اور کتنی واجب ہے؟“ فرمایا مذہب کی فقہ کی رو سے یا مذہب فقراء کی نظر میں؟ سائل نے کہا دونوں طرح سے ارشاد فرمائیے جواب ملا، فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ سال گزرنے پر سو درہم میں سے ڈھائی روپے نکال دو، اور فقراء کے مذہب میں یہ ہے کہ جو کچھ مال و دولت ہو، سب غنا کی راہ میں لٹا دو۔“

انسان فطرانہ فی الطبع ہے، مل جل کر رہتا اور لو اور دو کے اصول پر عمل کرتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے، اس کے کچھ فرائض ہیں اور کچھ حقوق، انسانوں کی بستی میں مفلاؤں کو اتے بھی ہیں اور جھگڑے بھی پیدا ہوتے ہیں، مگر صوفیاء کرام انسان کو زندگی گزارنے کا کیا ڈھنگ سکھاتے ہیں؟ تجارتی بنیادوں پر زندگی؟ کچھ لو اور کچھ دو کے اصولوں پر

زندگی، جیو اویسے دو کی پالیسی والی زندگی؟ تحفظ خویش کے نظریہ کی زندگی؟ نہیں، یوں نہیں، بلکہ صوفیاء کرام ترک وائیک اور صروت، اخوت سے معمور زندگی کا درس دیتے ہیں، ”بھلا کر بھلا ہوگا“ کے بجائے ”سب کا بھلا“ ان کا نعرہ مستانہ ہوتا ہے ”دوستوں سے گلہ“ ان کا شیوہ نہیں اور شکایت زمانہ“ ان کا شعار نہیں، شیخ جنیدؒ بعد ازیں اس نظریے کی یوں ترجمانی فرماتے ہیں:-

”کوئی شخص اس وقت تک عارف نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ زمین کی طرح نہ ہو جائے کہ نیک و بد اسے روندتے ہیں اور بادل کی طرح نہ ہو جائے جو ہر چیز پر سایہ کرتا ہے اور سورج کی طرح نہ ہو جائے جو ہر ذرے کو روشن کرتا ہے اور بادش کی طرح نہ ہو جائے جو ہر چیز کو سیراب کرتی ہے۔“

تصوف کا دستور اور اہل تصوف کا شروع سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ہر کام میں مقصدیت کے مشکلاشی ہوتے ہیں، ان کے نزدیک ایسا علم محض الفاظ کا گورکھ دھندہ ہے جو عمل سے خالی ہے، وہ الفاظ و حروف کے رٹنے کو صرف دماغ سوزی قرار دیتے ہیں، عمل کے لیے تو علم ضروری ہوتا ہی ہے مگر علم کے لیے عمل اس سے بھی زیادہ ضروری ہے، ورنہ علم بے معنی، خیالات کا ٹانگ اور افکار کی شعبہ بندی بن جاتا ہے، اسی نظریے کو ایک مرد حق اکاہ نے یوں واضح کیا:-

”خواجہ نظام الدین دہلویؒ نے مکارم اخلاق کے بارہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: ”شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ اور ابوعلی سیناؒ کی ملاقات ہوئی، رخصت ہونے سے قبل ابوعلی سیناؒ نے ایک صوفی سے جو حضرت شیخ کے کے ملازموں سے تھا یہ فرمائش کی کہ جب میں حضرت شیخؒ کے یہاں سے رخصت ہو جاؤں تو پھر وہ جو کچھ میرے بارے میں کہیں تم مجھے لکھ بھیجنا

بوعلی سینا چلے گئے مگر حضرت شیخؒ نے اُن کا کوئی ذکر نہ کیا، اُن کے
 بارے میں ابھی یا برسی کسی قسم کی رائے کا اظہار نہ فرمایا، چنانچہ ایک روز
 اُس صوفی نے پوچھ ہی لیا کہ بوعلی سینا کیسا آدمی ہے؟ حضرت شیخؒ
 نے جواب دیا وہ ایک فیلسوف شخص ہے، طبیب ہے بڑا عالم بھی ہے
 البتہ مکارم اخلاق کا مالک نہیں (امام مکارم اخلاق نذار) اس صوفی نے
 یہ بات بوعلی سینا کو کلمہ بھیجی، بوعلی سیناؒ نے حضرت شیخؒ کی خدمت
 میں کچھ تحریر کیا، جس میں یہ بھی مذکور تھا کہ میں نے اتنی کتابیں مکارم اخلاق
 کے بارے میں لکھی ہیں، پھر حضرت شیخؒ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں مکارم اخلاق
 کا مالک نہیں، حضرت شیخؒ نے مبسم فرمایا اور گویا ہوئے، میں نے تو یہ نہیں
 کہا کہ بوعلی سیناؒ مکارم اخلاق جانتا نہیں (من نگختہ ام کہ بوعلی مکارم
 اخلاق نداند) میں نے تو یہ کہا ہے کہ وہ مکارم اخلاق کا مالک نہیں۔
 (مکارم اخلاق نذار) اے!

روح تصوف

۱۔ تاریخ تصوف: رئیس احمد جعفریؒ، ص ۲۳۱، ۲۳۲

۲۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ: پروفیسر نور بخش توکلی، ص ۳۶۴۔ مطبوعہ نوری بک ڈپو، لاہور،

۳۔ تجدید تصوف و سلوک: مولانا عبدالباری ندوی، ص ۱۹۰، ۱۸۱۔ مطبوعہ لکھنؤ،

۴۔ مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ سعد حسن خان یوسفی ص ۲۴۶۔ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔

۵۔ الکشف عن مہمات التصوف: مولانا اشرف علی تھانویؒ، ص ۳۸۔ مطبوعہ

سجاد پبلشرز لاہور۔

۶۔ تعارف، محمد بن اسحاق کلاباذیؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۳۳۔ مطبوعہ المعارف لاہور،

۷۔ تاریخ تصوف: پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ ص ۳۶۹۔ مطبوعہ علماء اکیڈمی محکمہ

اوقاف لاہور۔

۸۔ تعارف، محمد بن اسحاق کلاباذیؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۳۸۔ مطبوعہ

المعارف لاہور۔

۹۔ ایضاً ص ۱۳۸

۱۰۔ ایضاً ص ۱۳۸

۱۱۔ علم تصوف: عباد الشراختر ص ۲۳۔ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

۱۲۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۳۳۳۔ مطبوعہ

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۲۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ کشف المحجوب: سید علی البحریریؒ، ترجمہ: میاں طفیل محمد ص ۹۳ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور۔

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ کشف المحجوب: سید علی البحریریؒ، ترجمہ سید ابوالحسنات ص ۱۳۱ مطبوعہ المعارف لاہور۔

۲۵۔ فتوح الغیب: شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ترجمہ سید محمد فاروق القادری، ص ۱۳۱ مطبوعہ المعارف لاہور۔

۲۶۔ آداب المریدین: شیخ ضیاء الدین سرحدی، محمد عبدالباسط ص ۲۵ مطبوعہ المعارف لاہور۔

۲۷۔ ایضاً ص ۲۵

۲۸۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۲۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۲۹۔ ایضاً

شرعیات و طریقت

۱۔ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ص ۲۲ مطبوعہ انجمن خدام القرآن لاہور۔

۲۔ مسدح : شیخ عبدالحق محدث دہلوی : ترجمہ پیرزادہ اقبال احمد فاردی ص ۶ مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور۔

۳۔ ایضاً : ص ۶۲

۴۔ رسالہ قشیریہ : شیخ ابوالقاسم قشیری : ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۶۲ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۵۔ ایضاً ص ۶۳

۶۔ ایضاً ص ۶۳

۷۔ مکتوبات صدی : شیخ یحییٰ منیری : ترجمہ شاہ نجم الدین فردوسی ص ۳۰۱
۸۔ صد میدان : شیخ عبداللہ انصاری : ترجمہ پروفیسر افضل نقر ص ۱۵ مطبوعہ المعارف لاہور۔

۹۔ مکتوبات صدی : شیخ یحییٰ منیری : شاہ نجم الدین فردوسی ص ۳۰۲

۱۰۔ ایضاً ص ۲۱۳

۱۱۔ عوارف المعارف : شیخ شہاب الدین سہروردی : ص ۸۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

۱۲۔ رسالہ قشیریہ : شیخ ابوالقاسم قشیری : ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۶ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔



۱۳۔ رسالہ قشیریہ، شیخ ابوالقاسم قشیری، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۶۳ مطبوعہ
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد،

۱۴۔ ایضاً ص ۶۴

۱۵۔ ایضاً ص ۶۵

۱۶۔ تاریخ تصوف، پروفیسر یوسف سلیم چشتی ص ۲۰۵ مطبوعہ علماء اکیڈمی اوقاف لاہور،

۱۷۔ ایضاً ص ۱۹

۱۸۔ فوائد الفوائد، خواجہ نظام الدین دہلوی، مرتبہ، خواجہ حسن دہلوی، ترجمہ، پروفیسر
محمد سرور مطبوعہ محکمہ اوقاف لاہور

۱۹۔ رسالہ قشیریہ، شیخ ابوالقاسم قشیری، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۴۶ مطبوعہ ادارہ
تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۲۰۔ عوارف المعارف، شیخ شہاب الدین مہر دہلوی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔

کشف و کرامت

- ۱۔ فوائد القواد، خواجہ حسن دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۵۱ مطبوعہ محکمہ اوقاف
پنجاب لاہور۔
- ۲۔ مکتوبات مجددؒ: شیخ احمد سرہندیؒ، ترجمہ مولانا سعید احمد نقشبندی، دفتر ازل
ص ۲۱۲ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔
- ۳۔ انفاس العارفین، شاہ ولی اللہ: ترجمہ سید محمد فاروق القادری ص ۵ مطبوعہ
المعارف لاہور۔
- ۴۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم القشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۴۲ مطبوعہ
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۵۔ مکتوبات مجددؒ: شیخ احمد سرہندیؒ، ترجمہ مولانا سعید احمد نقشبندی ص ۲۹۴
مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔
- ۶۔ فوائد القواد، خواجہ حسن دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۴ مطبوعہ محکمہ اوقاف
پنجاب لاہور۔
- ۷۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ترجمہ سید محمد فاروق القادری ص ۷
مطبوعہ المعارف لاہور۔

اشاعت اسلام اور صوفیاء کرام

- ۱۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۶۳ تا ۶۶ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔
- ۲۔ دعوت اسلام: پروفیسر آرنلڈ، ترجمہ شیخ عنایت اللہ ص ۲۴۴ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۳۔ مقالات دینی و علمی: پروفیسر محمد شفیع ص ۹۴ مطبوعہ احمد ربانی ریویو سروس پاکستان
- ۴۔ سیر العارفین: حامد بن فضل اللہ رحمانی، ترجمہ محمد الوب قادری ص ۴۵ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور۔
- ۵۔ ایضاً
- ۶۔ فوائد القواد: خواجہ نظام الدین دہلوی، ترجمہ پروفیسر محمد سعید، ص ۱۶۲ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۷۔ سیر الاولیاء بکوالہ تارخ دعوت و عزیمت، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۷۷ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔
- ۸۔ دعوت اسلام: پروفیسر آرنلڈ، ترجمہ شیخ عنایت اللہ، ص ۲۶۸ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۹۔ ایضاً ص ۲۶۹
- ۱۰۔ ایضاً
- ۱۱۔ مقالات دینی و علمی: پروفیسر محمد شفیع ص ۹۵ مطبوعہ احمد ربانی ریویو سروس پاکستان۔
- ۱۲۔ آب کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ص ۱۹۴ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔

۱۳۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: پروفیسر محمد ایوب قادری، ص ۶۷ مطبوعہ ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی۔

۱۴۔ تاریخ دعوت و عزیمت: مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۵۹ ج ۱ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۱۵۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۳۴۴ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۱۶۔ رود کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ص ۸۸ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔

۱۷۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۳۴۵ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۱۸۔ تذکرہ مشائخ قادریہ: محمد دین کلیم ص ۱۷۷ مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور۔

آئین جوان مردان حق گوئی و سبکی

- ۱۔ تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۶۷، ۷۵، مطبوعہ دارالموئین اسلام آباد،
- ۲۔ ایضاً ص ۷۶
- ۳۔ تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ج ۱ ص ۲۷۹ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔
- ۴۔ ایضاً
- ۵۔ فیوض یزدانی، مجلس ص ۵۱
- ۶۔ تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ج ۳ ص ۱۶۳-۱۶۴ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔
- ۷۔ آب کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، ص ۴۱۲ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔
- ۸۔ ایضاً
- ۹۔ ایضاً ص ۴۵۸
- ۱۰۔ ایضاً
- ۱۱۔ تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۲۲ مطبوعہ دارالموئین اسلام آباد۔
- ۱۲۔ رود کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ص ۸۸ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔
- ۱۳۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، پروفیسر محمد ایوب قادری ص ۶۶ ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی۔
- ۱۴۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ، نور بخش توکلی ص ۲۷۳-۲۷۴ مطبوعہ نوری پبلشرز لاہور۔

فقر غریور

- ۱۔ الشعراء : ۱۰۵ تا ۱۰۹
- ۲۔ الشعراء : ۱۲۳ تا ۱۲۷
- ۳۔ الشعراء : ۱۴۱ تا ۱۴۵
- ۴۔ الشعراء : ۱۶۰ تا ۱۶۴
- ۵۔ الشعراء : ۱۸۰
- ۶۔ یسین : ۲۱ - ۲۲
- ۷۔ الثوری : ۲۳
- ۸۔ معارف الحدیث : مولانا محمد منظور نعمانی ج ۲ ص ۱۰۹
- ۹۔ خطہ پاک ادب : شہاب دہلویؒ، حاشیہ بحوالہ اخبار الاخبار، ص ۲۶۵
مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور۔
- ۱۰۔ فوائد القواد : خواجه نظام الدین دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۷۵ مطبوعہ
محکمہ اوقاف لاہور۔
- ۱۱۔ سیر العارفين : حامد بن فضل اللہ جمالیؒ، ترجمہ محمد ایوب قادری ص ۲۸ مطبوعہ
مرکزی اردو بورڈ لاہور۔
- ۱۲۔ فوائد القواد : خواجه نظام الدین دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۱۸-۲۱۹
مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۱۳۔ تاریخ مشائخ چشت : خلیق احمد نظامی ص ۱۹۳ مطبوعہ دارالمؤلفین اسلام آباد۔
- ۱۴۔ ص ۱۳۸

تاج شہی فقر کے قدموں پر

- ۱۔ خطہ پاک اوج، شباب و بھومی ص ۲۷۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاول پور۔
- ۲۔ آب کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، ص ۲۶۷ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔
- ۳۔ ایضاً
- ۴۔ سیر العارفین: حامد بن فضل الشہجالی ترجمہ: محمد ایوب قادری ص ۲۶-۲۷ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ۔
- ۵۔ ایضاً
- ۶۔ ایضاً
- ۷۔ ایضاً
- ۸۔ رود کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ص ۸۸ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔
- ۹۔ ایضاً
- ۱۰۔ ایضاً
- ۱۱۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۳۴۵ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی
- ۱۲۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ دہلوی، ترجمہ سید محمد فداوق القادری ص ۵۵ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۱۳۔ ایضاً
- ۱۴۔ تذکرہ مشائخ قادریہ، محمد دین کلیم، ص ۱۷۵ مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور۔
- ۱۵۔ تذکرہ شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۷۷ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

توکل

- ۱۔ یونس : ۸۴
- ۲۔ المائدہ : ۲۳
- ۳۔ یونس : ۷۱
- ۴۔ الاعراف : ۸۹
- ۵۔ یونس : ۸۴
- ۶۔ الشعراء : ۲۱۷
- ۷۔ الرعد : ۳۰
- ۸۔ ہود : ۸۸
- ۹۔ آل عمران : ۱۵۸
- ۱۰۔ رسالہ قشیریہ امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، ص ۲۶۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
- ۱۱۔ تقریر : محمد بن اسحاق کلابازیؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۵۵ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۱۲۔ ایضاً
- ۱۳۔ ایضاً ص ۱۵۶
- ۱۴۔ رسالہ قشیریہ، ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ پیر محمد حسن ص ۲۶۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۱۵۔ ایضاً ص ۲۶۴
- ۱۶۔ منهاج العابدین : امام غزالیؒ، ترجمہ مولانا سعید احمد نقشبندی ص ۸۳ مطبوعہ

فقر

- ۱۔ کشف المحجوب: سید علی البحریریؒ: ترجمہ ایف ڈی گوہر ص ۸۴
- ۲۔ ایضاً ص ۸۶
- ۳۔ آداب المریدین: شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ: ترجمہ محمد عبدالباسط ص ۱۹
مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۴۔ تعارف: محمد بن اسحاق کلاباذیؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۶ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۵۔ رسالہ قشیریہ: ابوالقاسم القشیریؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۲۶ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۶۔ تعارف: محمد بن اسحاق کلاباذیؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۶ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۷۔ کشف المحجوب: سید علی البحریریؒ: ترجمہ ایف ڈی گوہر ص ۸۶
- ۸۔ رسالہ قشیریہ: ابوالقاسم القشیریؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۹۹ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۹۔ ایضاً ص ۱۸۸
- ۱۰۔ ایضاً ص ۱۹۹
- ۱۱۔ تعارف: محمد بن اسحاق کلاباذیؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۶ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۱۲۔ رسالہ قشیریہ: ابوالقاسم قشیریؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۹۹ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

توبہ

- ۱۔ صدی میدان: شیخ عبداللہ انصاری: ترجمہ پر فقیر افضل فقیر ص ۱۷۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۲۔ النساء: ۱۱۷
- ۳۔ النمل: ۱۱۹
- ۴۔ مشکوٰۃ المصابیح: باب الاستغفار والتوبہ ص ۵۱ مطبوعہ رحمانیہ لاہور۔
- ۵۔ صدی میدان: شیخ عبداللہ انصاری: ترجمہ پر فقیر افضل فقیر ص ۱۷۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۶۔ تعریف: امام ابوالاسحاق کلاباذی: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۷۔ ایضاً: . . . ص ۱۲۷
- ۸۔ ایضاً: . . . ص ۱۲۷
- ۹۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۷ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۱۰۔ تعریف: امام ابوالاسحاق کلاباذی: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۱۱۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۷ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۱۲۔ ایضاً: . . .
- ۱۳۔ ایضاً: . . . ص ۱۲۷

تقویٰ

۱۔ المائدہ : ۲

۲۔ رسالہ قشیریہ : ابوالقاسم قشیریؒ، ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۹۸ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۳۔ عوارف المعارف : شیخ شہاب الدین سروردیؒ ص ۷ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔

۴۔ رسالہ قشیریہ : ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۵۔ بخاری و مسلم۔

۶۔ مشکوٰۃ۔

۷۔ فتوح الغیب : شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ترجمہ سید محمد فاروق القادری ص ۸۶ مطبوعہ المعارف لاہور۔

۸۔ رسالہ قشیریہ : امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۰ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۹۔ کیمیائے سعادت : امام غزالیؒ، ترجمہ مجید یزدانی ص ۹۲۸ مطبوعہ ناشران قرآن لاہور۔

۱۰۔ رسالہ قشیریہ : امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۱۲ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۱۔ تعریف : ابوالسحاق کلاباذیؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۹ مطبوعہ المعارف لاہور۔

۱۲۔ کیمیائے سعادت، امام غزالیؒ: ترجمہ مجید یزدانی، ص ۹۳۱ مطبوعہ ناشران قرآن لاہور۔

۱۳۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم القشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۰۶ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۴۔ کیمیائے سعادت، امام غزالیؒ: ترجمہ مجید یزدانی، ص ۹۴۴ مطبوعہ ناشران قرآن لاہور۔

۱۵۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۳۱۱ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۶۔ صد میدان: شیخ عبداللہ انصاریؒ: ترجمہ پروفیسر افضل فقیر ص ۷۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔

صبر

- ۱۔ آل عمران : ۱۸۶
- ۲۔ البقرہ : ۱۷۷
- ۳۔ آل عمران : ۱۴۲
- ۴۔ آل عمران : ۱۲۰
- ۵۔ صد میدان : شیخ عبداللہ انصاریؒ : ترجمہ پروفیسر افضل فقیر، ص ۲۹۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۶۔ تعرف : ابوالسحاق کلاباذیؒ : ترجمہ : ڈاکٹر پیر محمد حسن، ص ۱۴۳ مطبوعہ المعارف لاہور،
- ۷۔ رسالہ تشریح : ابوالقاسم قشیریؒ : ترجمہ : ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۹۶ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔
- ۸۔ ایضاً
- ۹۔ طریق النجات : شیخ محمد حسن مجددی فاروقیؒ ص ۱۴۸

فتوت

۱۔ الحشر: ۱

۲۔ رسالہ قشیریہ، امام ابوالقاسم قشیریؒ؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ۳۵۴ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔

- ۳۔ ۳۵۵
- ۴۔ ایضاً ۳۵۶
- ۵۔ ایضاً ۳۵۷
- ۶۔ ایضاً ۳۶۰
- ۷۔ ایضاً ۹۴

ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

۱۔ فوائد الغواد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۲۳ مطبوعہ
محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔

۲۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ: نور بخش کوکلی: ص ۱۲۷ مکتبہ نوری بکڈپو لاہور۔

۳۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ پیر محمد حسن ص مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی
اسلام آباد۔

۴۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ: نور بخش کوکلی: ص ۱۳۱ مطبوعہ نوری بکڈپو لاہور۔

۵۔ فوائد الغواد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۱۶۶ مطبوعہ محکمہ اوقاف
پنجاب لاہور۔

۶۔ تذکرہ مشائخ قادریہ: محمد دین کلیم ص ۸۷ مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور۔

۷۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۸۷ مطبوعہ ادارہ تحقیقات
اسلامی، اسلام آباد۔

۸۔ فوائد الغواد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۱۲ مطبوعہ محکمہ اوقاف
پنجاب لاہور۔

۹۔ مکتوبات صدی: شیخ شرف الدین یحییٰ منیری: ترجمہ شاہ نجم الدین فردوسی، ص ۳۵۰

۱۰۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص مطبوعہ ادارہ
تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۱۔ فوائد الغوائد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۳۶۱ مطبوعہ
محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔

اشاریہ

الف

۱۸۳	آدم علیہ السلام
۱۴۸	آدم ، بنوری ، شیخ ،
۱۰۰ ، ۹۹ ، ۹	آرنلڈ ، پروفیسر ،
۵۰	ابراہیم (علیہ السلام)
۱۶۳	ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ ،
۱۹۳	ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ ،
۱۱۷	ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ ، دقاق شیخ ،
۱۴۷	ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ ، عادل ،
۱۸۴	ابلیس ،
۸۳	ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ، امام ،
۴۴	ابن خلدون ، علامہ ،
۷۸	ابن خلکان ،
۱۷	ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ ، محی الدین ، شیخ ،
۴۷	ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ -
۱۰۲	ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ، گزرونی ،
۹	ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ، طہستانی ،
۱۹۹ ، ۴۸	ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ، کٹانی ،
۱۸۴ ، ۱۷۴ ، ۱۷۳ ، ۱۷۰ ، ۱۶۸ ، ۱۶۷ ، ۱۵۳ ، ۱۵۱ ، ۱۱۷	ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ، محمد بن اسحاق ،

۱۹۶	ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ، دراق ، شیخ ،
۱۵۳	ابوتراب رحمۃ اللہ علیہ ، نخشی ،
۱۶۱	ابوحفص رحمۃ اللہ علیہ ، حداد ،
۱۶۵	ابوحفص رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،
۲۹	ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،
۱۴۹ ، ۵۳	ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ ، سیروانی ، شیخ ،
۱۶ ، ۱۴۰	ابوالحسن ، علی ، ندوی مولانا ،
۶۵	ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ ، قوشچی ،
۲۹	ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ ، مزین ،
۱۶۰	ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ ، دراج شیخ ،
۱۴۶ ، ۶۱ ، ۵۳ ، ۲۹ ، ۲۷ ، ۸	ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ ، نوری ، شیخ ،
۲۰۵	ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ ، ابوالخیر ، شیخ ،
۲۹ ، ۸	ابوسهل ، رحمۃ اللہ علیہ ، معلوی ، شیخ ،
۵۶	ابوعثمان رحمۃ اللہ علیہ ، حیری ، شیخ ،
۶۰	ابوالعلاء رحمۃ اللہ علیہ ، امیر شیخ ،
۵۶	ابوعلی رحمۃ اللہ علیہ ، احمد ، شیخ ،
۱۹۶ ، ۱۶۴ ، ۱۶۹ ، ۱۶۱	ابوعلی رحمۃ اللہ علیہ ، دقاق ، شیخ ،
۲۰۳	ابوعلی ، محمد بن عبد الوہاب ،
۱۶۱	ابوعمر رحمۃ اللہ علیہ ، امام ،
۱۸۳	ابوعمر رحمۃ اللہ علیہ ، دمشقی ،
۱۴۵	ابوالفتح رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،
۵۷	ابوالقاسم رحمۃ اللہ علیہ ، دمشقی ،
۱۸۸	ابومحمد رحمۃ اللہ علیہ ، رویم البغدادی -

- ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ ، یسین ، شیخ : ۱۷۰
- ابونعیم : ۱۶
- ابوالوفار ، یحییٰ ، قاضی : ۱۱۴
- ابولعقوب رحمۃ اللہ علیہ ، سوسی : ۱۸۹ ، ۵۴
- احرار رحمۃ اللہ علیہ ، عبید اللہ خواجه : ۱۴۷ ، ۶۶
- احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ، امام : ۲۳
- احمد بن یحییٰ الجلاء رحمۃ اللہ علیہ : ۱۷۰
- احمد خان بہمنی ، سلطان : ۱۴۷
- احمد رحمۃ اللہ علیہ ، سرہندی ، شیخ : ۱۲۲ ، ۴۲
- احمد کبیر رحمۃ اللہ علیہ ، سید : ۱۰۲
- احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ : ۱۸۴
- اسحاق (علیہ السلام) : ۵۰
- اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ : ۱۰۲ ، ۹۹
- اشرف ، جہانگیر ، سمنانی ، شیخ : ۱۴۳
- اشرف علی ، تھانوی ، مولانا : ۴۵
- افضل خان : ۱۲۳
- اقبال رحمۃ اللہ علیہ ، علامہ : ۶۴
- اکبر ، بادشاہ : ۱۱۴ ، ۱۲۲ ، ۱۴۷ ، ۱۴۸
- اکرام ، محمد ، ڈاکٹر ، شیخ : ۱۴۳ ، ۱۰۲
- التمش ، شمس الدین ، سلطان : ۱۱۹ ، ۱۲۲ ، ۱۳۴ ، ۱۴۴ ، ۱۴۶
- امیر حسن رحمۃ اللہ علیہ ، لاہوری : ۷۲
- امیر محمد خان ، امیر الدولہ : ۱۴۱
- انس رضی اللہ عنہ ، حضرت : ۱۷۹ ، ۱۷۲

۱۶۶ ، ۵۰

ایوب (علیہ السلام) :

ب

۱۲۱

بابر، ظہیر الدین، سلطان :

۴۳

بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ، اسحاق، خواجه :

۱۴۴ ، ۱۴۳

برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ، بلخی، شیخ :

۱۱۷

برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

۱۰۱

برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ، عزیز، شیخ :

۱۴۴ ، ۱۴۳

برہان الدین، مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ :

۱۶۳ ، ۶۷ ، ۵۷

بسطامی رحمۃ اللہ علیہ، بایزید، شیخ :

۲۳

بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ :

۱۴۴ ، ۱۳۶

بلبن، غیاث الدین، سلطان :

۱۴۶

بلند اقبال، شہزادہ :

۱۷۵

بو شہی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

۲۰۵

بو علی، سینا :

۱۰۳

بو علی رحمۃ اللہ علیہ، قلندر :

۱۴۴ ، ۱۲۰ ، ۱۱۶

بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ، زکریا :

۲۰۳ ، ۲۰۳ ، ۱۷۸

بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ، نقشبند :

۱۴۶

بہمن، یارخان :

ت

۱۳۳

تبرک، نور، شیخ :

۱۸۹ ، ۱۶۰ ، ۱۶۰ ، ۱۵۴ ، ۲۶

تستری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

marfat.com

Marfat.com

تعلق ، فیروز ، سلطان :

تعلق ، محمد ، سلطان :

تمنگی خان ، :

توکل رحمۃ اللہ علیہ ، انبالوی شاہ :

۱۱۷ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۱۲۰

۱۱۷ ، ۱۲۰

۱۱۹

۱۲۹

ج

۹۹

۲۰۰ ، ۱۷

۱۳۸

۴۱

۴۸ ، ۸

۱۹۸

۱۰۲

۱۲۹ ، ۱۰۳

۱۹۱ ، ۹۷ ، ۹۲ ، ۹۱ ، ۹۰ ، ۵۲ ، ۴۷ ، ۴۶ ، ۴۵ ، ۴۴ ، ۴۳ ، ۴۲ ، ۴۱ ، ۴۰ ، ۳۹ ، ۳۸ ، ۳۷ ، ۳۶ ، ۳۵ ، ۳۴ ، ۳۳ ، ۳۲ ، ۳۱ ، ۳۰ ، ۲۹ ، ۲۸ ، ۲۷ ، ۲۶ ، ۲۵ ، ۲۴ ، ۲۳ ، ۲۲ ، ۲۱ ، ۲۰ ، ۱۹ ، ۱۸ ، ۱۷ ، ۱۶ ، ۱۵ ، ۱۴ ، ۱۳ ، ۱۲ ، ۱۱ ، ۱۰ ، ۹ ، ۸ ، ۷ ، ۶ ، ۵ ، ۴ ، ۳ ، ۲ ، ۱

۲۰۵ ، ۱۹۳ ، ۱۸۵ ، ۱۸۴

۱۷۵ ، ۱۷۳

۱۴۸

جنید بن محمد رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ :

جہانگیر ، نور الدین ، بادشاہ :

ح

۱۸۳

۹۲ ، ۷۷ ، ۷۶

۱۲۷ ، ۱۲۵ ، ۱۲۴

حاتم اسم رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ :

حارث المحاسبی رحمۃ اللہ علیہ :

حامد بن فضل اللہ ، جمالی :

- ۱۸۸ : حذیفہ رحمۃ اللہ علیہ ، مرعشی
 ۱۰۱ : حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ مولانا
 ۲۹ : حسن رحمۃ اللہ علیہ ، بصری ، خواجه
 ۴۲ : حسن رحمۃ اللہ علیہ ، دہلوی ، خواجه
 ۵۳ : حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ
 ۱۲۴ : حسین رحمۃ اللہ علیہ ، شاہ
 ۵۰ : حصری رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ
 ۱۳۴ : حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ ، ناگوری ، شیخ

خ

- ۱۵۹ ، ۹۲ ، ۷۷ ، ۵۷ : خازن رحمۃ اللہ علیہ ، ابوسعید ، شیخ
 ۷۲ : خسرو رحمۃ اللہ علیہ ، امیر
 ۴۸ : خلیف بغدادی رحمۃ اللہ علیہ
 ۱۲۲ : خواص ، خان
 ۱۴۰ : خورشید ، جاہ ، نواب

ذ

- ۱۸۸ ، ۱۸۱ ، ۱۷۵ ، ۵۴ : ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ ، مصری ، شیخ

ر

- ۱۳۴ ، ۱۳۳ : رضیہ سلطانہ
 ۱۴۶ ، ۱۴۴ ، ۱۲۱ : رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ ، ملتانی ، شاہ
 ۵۷ ، ۴۹ : رود باری رحمۃ اللہ علیہ ، ابوعلی ، شیخ

۱۰۵ : رؤف احمد، مجددی، شیخ :

ز

۱۴۸ : زیر رحمۃ اللہ علیہ، سرمندی، خواجہ :
 ۵۰ : زکریا علیہ السلام، حضرت ،
 ۱۱۶، ۱۱۷ : زین الدین رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

س

۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ : سراج رحمۃ اللہ علیہ، ابونصر، شیخ :
 ۱۰۱ : سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، عثمان، مولانا :
 ۱۴۱، ۱۰۵ : سرسید، احمد خان :
 ۱۸۵، ۱۸۴، ۹۲ : سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :
 ۹۸ : سعد الدین رحمۃ اللہ علیہ، حمویہ :
 ۱۹ : سعدی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :
 ۱۴۸ : سعد اللہ، خان :
 ۱۱۳ : سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ :
 ۱۴۲، ۴ : سلمان رضی اللہ عنہ، فارسی :
 ۱۴۸ : سلیم :
 ۱۴۸ : سلیم رحمۃ اللہ علیہ، چشتی :
 ۱۹۶ : سلیمان علیہ السلام، حضرت :
 ۴۸ : سمون رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :
 ۱۲۴ : سیف الدین :
 ۹۸ : سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ، حمویہ :

ش

- شاه جهان : ۱۲۹، ۱۲۳
 شبلی رحمۃ اللہ علیہ، ابوبکر، شیخ : ۵۳، ۱۶۲، ۱۶۸، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴
 شعرائی رحمۃ اللہ علیہ، عبدالوہاب : ۱۷
 شعیب علیہ السلام : ۱۳۰، ۱۵۶، ۱۵۷
 شفیق رحمۃ اللہ علیہ، بلخی، خواجه : ۱۹۸
 شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ، سہروردی، شیخ : ۱۷، ۲۹، ۵۱، ۶۳، ۷۷، ۸۱
 شہرستانی : ۷۸
 شیخ اکبر، محی الدین : ۸۸

ص

- صالح علیہ السلام : ۱۲۹
 صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت : ۸۰

ض

- ضیاء الدین، برہنی، پروفیسر : ۱۰۳
 ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ، سہروردی، شیخ : ۵۱، ۷۷، ۱۶۶

ع

- عارف، ارشاد احمد، سید : ۳۳
 عالمگیر، اونگک زیب : ۱۲۳، ۱۲۷
 عائشہ رضی اللہ عنہا، سیدہ : ۱۳۱
 عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ، محدث دہلوی، شیخ : ۴۱، ۵۵، ۱۳۳

گ

گب، ایچ، آر

۱۰

گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ، فرید الدین عریض، ۲۹، ۶۲، ۷۳، ۷۸، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۴

۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۸، ۲۰۲

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، عبدالقدوس، شیخ

۱۲۱، ۱۲۲

۱۲۷

گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، محمد، شیخ

۲۳، ۲۶، ۲۹، ۳۳

گیلانی، خورشید احمد، سید

ل

۱۲۱

لودھی، سکندر

۱۲۹

لوٹ، علیہ السلام

م

۱۲۷

مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام

۱۲۰

محب اللہ رحمۃ اللہ علیہ، امرودی

۱۲۷

محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ، نجدی

۱۲۸

محمد بن علی نقشب رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۸

محمد بن الفضل

۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

۱۲۹

محمد بن محمد رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۲

محمد حسن، رحمۃ اللہ علیہ، نجدی، شیخ

۱۱۹

محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ، بہمنی، سلطان

۱۱۷

محمد شاہ، غازی، سلطان

۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳

محمد شفیق، ڈاکٹر

۱۲۷

محمد موسیٰ، حکیم، امرتسری

۱۲۴، ۱۲۳، ۱۰۴	معصوم رحمۃ اللہ علیہ، نجم، سرسندی :
۱۲۴، ۱۰۱، ۹۹، ۷۳، ۲۹	معین الدین رحمۃ اللہ علیہ، چشتی، خواجہ :
۱۷۴	مغاذلی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :
۱۱۴	مقتضی لامر اللہ، خلیفہ :
۷	مقداد رضی اللہ عنہ، حضرت :
۷۸، ۷۷، ۱۷	مکی رحمۃ اللہ علیہ، ابوطالب، شیخ :
۱۱۳	ملک شاہ، سلجوقی :
۷۸	منصور رحمۃ اللہ علیہ، علاج :
۱۱۲	منصور، خلیفہ :
۱۵۹، ۵۰	موسیٰ علیہ السلام :
۱۲۹	میان میر رحمۃ اللہ علیہ، قادری :
۱۲۹، ۱۳۹، ۱۳۳	میر خوردم رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ :

ن

۱۱۹	ناصر الدین، قباچہ :
۱۲۷، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۷۳، ۶۸، ۷۱	نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ، چراغ دہلوی :
۶۸، ۶۶، ۶۲، ۲۹، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۸	نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ، اولیاد، خواجہ :
۲۰۵، ۲۰۳، ۲۰۲، ۱۲۷، ۱۳۶، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۰۱، ۹۸، ۷۳، ۷۲	نظام الملک، نواب :
۱۳۹	نعمان، میر :
۱۲۳	نوح علیہ السلام :
۱۵۸، ۱۵۶	نور بخش رحمۃ اللہ علیہ، توکلی، پردیس :
۱۳۹	نور الدین، سلطان :
۱۲۳	نور الدین رحمۃ اللہ علیہ، مبارک، شیخ :
۱۲۲	

و

- ولی الشہ، محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ : ۱۰۶۶، ۴۰، ۱۴۸، ۱۶۲
 وہیب بن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ :

ھ

- ہارون الرشید، خلیفہ : ۱۱۲، ۱۱۱
 ہارونی رحمۃ اللہ علیہ، عثمان، خواجه : ۴۳
 ہاشم رحمۃ اللہ علیہ، بکراتی، پیر : ۱۴۴
 ہمایوں، نصیر الدین، سلطان : ۱۴۴
 ہنٹر، ولیم، سر : ۹۴
 ہود علیہ السلام : ۱۲۹
 ہدیت خان شیروانی : ۱۲۲

ی

- یافعی رحمۃ اللہ علیہ : ۴۸
 یحییٰ (علیہ السلام) : ۵۰
 یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ : ۱۶۰
 یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ، نیری، شیخ : ۵۹، ۵۸

